کتاب نما کا خصوصی شمارہ

عابد علی خاں

شخصیت اور ادبی خدمات

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتّبہ

مجتبیٰ حسین

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر ـ شاہد علی خاں
مہمان اڈیٹر ـ مجتبیٰ حسین

قیمت سالانہ -/55 روپے
فی پرچہ - =/6 روپے
غیر ممالک کے لیے - ۳۲۰ روپے

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر - نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - اردو بازار - دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - پرنسس بلڈنگ - بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - یونی ورسٹی مارکیٹ - علی گڑھ 202002

پہلی بار فروری ۹۳ء

قیمت: =/45

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس - دریا گنج - نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

فہرست

مہمان مدیر
مجتبیٰ حسین

اداریہ

عابد علی خاں مرحوم بانی اڈیٹر روزنامہ "سیاست"، حیدرآباد کے بارے میں "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ "کتاب نما" نے اس سے پہلے اردو کے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور محققین کی خدمات کے اعتراف کے لیے کئی گرانقدر خصوصی شمارے شائع کیے ہیں لیکن "کتاب نما" کا یہ غالباً پہلا خصوصی شمارہ ہے جو اردو کے ایک صحافی کی خدمات کے اعتراف کے لیے مختص کیا جارہا ہے۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو عابد علی خاں نے ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے پیچھے اردو صحافت کی ایک ایسی روایت چھوڑ گئے جو اردو صحافت کے لیے ہمیشہ ایک مشعل راہ کا کام دے گی۔ عابد علی خاں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو یعنی ملک کی آزادی کے دو سال بعد اور سابق ریاست حیدرآباد کے ہندستان میں انضمام کے ایک سال بعد حیدرآباد سے روزنامہ "سیاست" کا اجرا کیا۔ ان دنوں، اردو صحافت، خاص طور پر دکن میں اور عمومی طور پر سارے ملک میں، انتہا پسندی، سنسنی خیزی اور اشتعال انگیزی کا شکار تھی۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں اور نیا معاشرہ وجود میں آرہا تھا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے، جو ملک میں اردو ذریعہ تعلیم کی واحد درسگاہ تھی، اردو کو نکالا جارہا تھا۔ سرکاری دفتروں میں بھی اردو کے چلن کو ختم کرنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان دگرگوں حالات میں عابد علی خاں نے نہایت معمولی وسائل کے ساتھ محض اپنے عزم اور حوصلہ کی بنیاد پر اردو صحافت کی عام روش سے ہٹ کر ایک غیر جانب دار غیر جذباتی اور معتدل صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ اردو قارئین اس طرح کی صحافت کے عادی نہیں تھے۔ اسی لیے روزنامہ "سیاست" کو اپنے قدم جمانے میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن عابد علی خاں نے ہمت نہیں ہاری اور اردو قارئین کے مزاج کو تبدیل کرنے اور اقلیتوں کے مسائل کو قومی پس منظر میں دیکھنے اور ان کا تجزیہ پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ "سیاست" کے قارئین کا ایک حلقہ بنتا چلا گیا اور "سیاست" کی آواز نہ صرف عوام میں بلکہ حکومت کے ایوانوں میں بھی سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ سنی جانے لگی۔

تعداد اشاعت کے اعتبار سے "سیاست" اس وقت ملک کا دوسرا بڑا

اخبار ہے لیکن صحافت کے معیار کے اعتبار سے یہ برصغیر کا سب سے اہم اخبار ہے جسے انگریزی اخباروں کے ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جنوبی ہند میں آج تک کسی اخبار کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہوسکا جو "سیاست" کو حاصل ہوا ہے۔ یہ اردو کا ایک ایسا مکمل اور عصری اخبار ہے جس کے پڑھنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ہی "سیاست" کی پانچ چھے ہزار کاپیاں روزانہ جاتی ہیں۔

"سیاست" کو یہ اعزاز عابد علی خاں کی انتھک محنت، لگن اور جستجو کے باعث حاصل ہوا۔ انھوں نے اخبار کے ذریعہ اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اپنے اخبار کو انھوں نے کبھی بھی اپنی شخصی تشہیر کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ حیدرآباد میں اردو کے بیسیوں ادارے قائم کیے۔ مستحق ادیبوں اور فنکاروں کی دستگیری کی حکومتِ ہند کی نگراں کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے گرانقدر تجاویز پیش کیں جن پر عمل بھی کیا گیا۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا اور سماچار بھارتی کے وہ ڈائرکٹر بھی رہے۔ ترقی اردو بورڈ کے رکن اور انجمن ترقی اردو کے نائب صدر بھی رہے۔ اردو کے لیے ان کی خدمات ہمہ جہت اور گوناگوں ہیں۔ وہ اردو کے ایک عظیم صحافی ہی نہیں تھے بلکہ اردو کے بے لوث خدمت گزار بھی تھے۔ آزادی کے بعد حیدرآباد کو اردو کا سب سے بڑا مرکز بنانے میں عابد علی خاں کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

"کتاب نما" کے اس خصوصی شمارہ میں عابد علی خاں مرحوم کی بیش بہا خدمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی شخصیت اور ان کی صحافتی خدمات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جناب شاہد علی خاں، جنرل منیجر مکتبہ جامعہ نے پچھلے مہینے مجھ ناچیز سے یہ خواہش کی کہ میں عابد علی خاں کی یاد میں شائع ہونے والے اس خصوصی شمارہ کو مرتب کروں۔ کم سے کم وقت میں مرحوم کے بارے میں مضامین اکٹھا کیے گئے۔ عابد علی خاں مرحوم کی گوناگوں خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے ایک ضخیم شمارہ بھی ناکافی ہے۔ لیکن پھر بھی اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا ایک خاکہ سامنے آسکے۔ آج کے نامساعد حالات میں عابد علی خاں نے اپنے اخبار کے ذریعہ اردو صحافت کو جو اعتبار اور توقیر عطا کی ہے وہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ عابد علی خاں مرحوم کے تئیں کتاب نما کے اس خراجِ عقیدت کی ادبی اور صحافتی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ہوگی۔

عابد علی خاں

کچھ اپنے بارے میں

من کہ میر عابد علی خاں ابن میر محمود علی خاں ابن میر حافظ علی خاں المخاطب انتخاب جنگ بہادر۔ اپنے بارے میں کچھ لکھنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ بھی مشکل کام ہے کہ ۶۴ سال کی اس داستان کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ میرے اعمال نامے میں دھرا ہی کیا ہے جس کے تذکرے کے لیے جواز پیدا ہو۔

جمعہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ بوقت فجر میری تاریخ پیدائش ہے۔ میں نے حیدر آباد کے ایک جاگیردار گھرانے میں ایک ایسے وقت جنم لیا، جب کہ جاگیردارانہ نظام نظامِ دکن کے اقتدار کے تحفظ کا دوسرا نام بنا ہوا تھا۔

میرے والد نواب میر محمود علی خاں نے بھی جن کے پدرِ محترم یعنی میرے دادا حافظ علی خاں انتخاب جنگ سے جو نظامِ ششم نواب میر محبوب علی خاں کے مدرسۂ عالیہ میں ہم جماعت اور حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم کے اتالیق تھے اور نانا عابد علی خاں (نواب صولت جنگ) سے غالباً دور بینی ورثے میں حاصل کی تھی اور جاگیردارانہ نظام کے تعلق سے نوشتۂ دیوار پڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنے دور کے بیشتر جاگیرداروں کے لڑکوں کے برخلاف ہم تمام بھائیوں کو اسکول اور کالج کی راہ دکھائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مال و دولت، یہ جاگیر و منصب، یہ جاہ و حشم سب عبث ہیں۔ یہ زیادہ دنوں تک کام دینے والی چیز نہیں۔ جو چیز اہم ہے، وہ تعلیم ہے۔ اسی سے تمھارے آباؤ اجداد کا نام باقی رہ سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جاگیرداروں کے بچّے ایک علیحدہ درس گاہ، جاگیردار کالج یا ثانوی درجے تک مدرسہ عالیہ میں پڑھا کرتے تھے۔ میری تعلیم کی ابتدا بھی مدرسہ عالیہ میں ہوئی، اور یہیں سے میں نے میٹرک کامیاب کیا۔ جاگیردارانہ گھرانوں کی روایات کے مطابق مجھے اعلا تعلیم کے لیے نظام کالج میں داخلہ لینا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے اردو ذریعۂ تعلیم کی واحد اور منفرد یونی ورسٹی جامعہ عثمانیہ کا انتخاب کیا اور اس مادرِ جامعہ نے جس میں ''انقلابی شاعر'' مخدوم کے نغمے گونجا کرتے تھے، مجھے امارت اور غربت کے فرق و تفاوت سے واقف کرایا۔ میں نے فلسفہ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ مجھے خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر شیو موہن لال اور ڈاکٹر ولی الدین جیسے بلند قامت دانشوروں کے

آگے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل رہا۔

جامعہ عثمانیہ ہی میں مخدوم سے ملنے کا موقع ملا تھا اور جب فارغ التحصیل ہو کر نکلا تو انھیں کی سنگت اور صحبت میں ادب و سیاست کی تحریکات سے اولاً نظری اور پھر عملی دل چسپی بڑھنے لگی یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" نکالا کرتے تھے۔ ان دنوں حیدرآباد سے کئی اردو اخبارات شائع ہوتے تھے، لیکن "پیام" ہی وہ اخبار تھا جو سیاسی بیداری اور ترقی پسند و جمہوری تحریکات کا علمبردار تھا۔ "پیام" سے اور قاضی عبدالغفار صاحب سے ربط کے علاوہ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی سرگرمیوں نے انقلاب کے تصوّر سے مجھے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگِ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ آمریت پر جمہوری اور اتحادی طاقتوں کا غلبہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا بھر کی نوجوان نسل ترقی پسند اور امن دوست تحریکات سے وابستہ ہو رہی تھی۔ میں بھی مخدوم، میر حسن اور سجاد ظہیر اور کیفی اعظمی جیسے ابھرتے ہوئے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کے قافلہ میں شامل ہو گیا۔ اسی لیے مجھے ۱۹۴۳ء میں اپنے شہر کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری بنایا گیا۔ ان ہی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی عظیم الشان تاریخی کل ہند کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ میں نے ۱۹۴۷ء تک یہ فرائض ادا کیے اور اشتراکیت کو انسانی دکھ درد کی نجات کے ایک نسخہ کی حیثیت سے قبول تو کر لیا۔ لیکن پارٹی کی باقاعدہ رکنیت قبول نہیں کی۔ کیوں کہ میں شروع ہی سے کسی جماعت سے وابستگی ناپسند کرتا رہا ہوں۔ یہ بھی میرے لیے ایک اعزاز تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود میں نے ہندستان میں پارٹی پر سے پابندی اٹھائے جانے کے بعد بمبئی میں منعقد ہونے والی پہلی پارٹی کانفرنس میں مخدوم کے ساتھ شرکت کی اور بمبئی میں ہی قیام کے دوران مجھے بنّے بھائی اور پروفیسر نورالحسن سے قریب ہونے اور ان سے کھل کر مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا۔ حیدرآباد سے جو ہندو بین اس کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے، ان میں میں واحد تھا، جسے بنّے بھائی کے گھر قیام کا موقع ملا۔ نورالحسن صاحب بھی ان دنوں بنّے بھائی کے ساتھ مقیم تھے۔ اس موقع پر مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ میں کارل مارکس کی کتاب WAGE-LABOUR AND CAPITAL کا ترجمہ کروں۔ یہ میرا پہلا قلمی کام تھا، جو کتابی شکل اختیار کر سکا۔ میں نے "جمہوریۂ چین" اور چین کی شخصیتوں پر دو اور کتابیں لکھیں۔ والد صاحب کی خواہش کے احترام میں نظام کی حکومت کے چھوٹے افسر کی حیثیت سے داخل ہوا لیکن اس حال و ماحول میں سرکاری ملازمت کا بندھن کب تک گوارا کرتا اور اربابِ مجاز بھی ایک ایسے آدمی کو کب تک سرکاری عہدے پر باقی و برقرار رکھتے جو سر پھرے انقلابیوں کا دوست تھا۔ گھر والے بھی میری ان سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کرنے لگے تھے۔ والد محترم کو بھی پتا چل گیا تھا کہ میں کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔

اپنے گھر اور اپنے ماحول سے ذہنی تصادم کی داستان اس مرحلہ پر اختتام کو پہنچی جب کہ ریاست حیدرآباد میں شخصی حکمرانی کا تار و پود بکھر کر رہ گیا اور یہ ریاست آزاد ہندستان کا

ایک جزو بن گئی۔ ایسے وقت میں صحافت کو اپنا پیشہ بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوکر ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء سے روزنامہ "سیاست" نکال رہا ہوں۔ ۴۶ برس کی عمر کے اس "کینوس" پر آپ کو نہ جانے کتنے ہی اچھے برے رنگ ملیں۔ جاذب نظر بھی اور آنکھوں میں چبھنے والے بھی، لیکن اس کینوس کو ایک روشن لکیر سی گھیری ہوئی ہے اور یہ لکیر میرے فکری ارتقاء کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرا اخبار جس دن شائع ہوا تھا اس دن سے کافی عرصہ تک اس کی (۸۰۰) کاپیاں بھی مشکل سے فروخت ہوتی تھیں۔ لیکن آج اس اخبار کا حلقۂ اشاعت وسیع ہوگیا ہے۔ "سیاست" ان چند اخباروں میں سے ہے جو اپنی تعداد اشاعت اور درجہ بندی کے لحاظ سے متوسط درجہ کے زمرے سے تعلق رکھتا ہے۔ "سیاست" آج میری میراث نہیں رہا ہے۔ یہ اس کے بے شمار پڑھنے والوں کی آواز بن گیا ہے اور آج بھی اسے وہ تمام طبقے اپنا ترجمان سمجھتے ہیں، جنھیں سیکولرازم، سوشلزم اور پُرامن بقائے باہم پر ایقان ہے۔

سیاست کی اشاعت کے آغاز کے بعد سے میری زندگی کی خانگی نوعیت ختم ہوگئی ہے سیاست کے صفحات میں ہر روز آپ جو کچھ دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ اس میں زندگی کی ہر اچھائی اور برائی جھلکتی نظر آئے گی۔ میں بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ سیاست میں خبروں کی ترتیب، معلوماتی مضامین و پس منظر کا مواد کچھ ایسا ہوتا ہے کہ نہ صرف اہلِ علم و دانشور بلکہ ایک عام قاری بھی اس کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اب خبر رسانی کے قومی اداروں اور ترسیل و ابلاغ کے عصری وسائل کی تنظیم جدید یا صحافتی امور کے کسی بھی مسئلہ میں سیاست کی رائے کو وقعت و اہمیت دی جارہی ہے چنانچہ قومی پریس کے نمائندوں کے دوش بدوش پریس ٹرسٹ آف انڈیا اور یو این آئی کے انضمام اور علاحدگیوں دونوں مرحلوں پر میں بھی ان اداروں کے ڈائرکٹروں میں شامل رہا اور یہ اعزاز اردو میں شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔ لیکن اس افتخار سے بڑھ کر یہ بات میرے لیے قابلِ عزت ہے کہ "سیاست" ملک کا واحد اردو اخبار ہے جسے کم و بیش تمام ہندستانی زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے اور اس میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کے کنبے کی طرح "سیاست" نے اپنے لکھنے والوں کا ایک خاندان بھی بنالیا ہے۔ انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ "سیاست" کے اڈیٹر کو بھی ایسے مباحث اور ایسے سیمناروں میں اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی ہے، جن میں قومی مسائل زیر بحث رہتے ہیں۔ اب اردو صحافت کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنا اور زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوشش کرنا ہی میرا مقصد حیات ہے سیاست کی آواز اور اس کے اثر کے باعث حکومتِ امریکا نے ۱۹۶۸ء میں صدارتی انتخابات کے معائنہ کی دعوت دی تھی۔ سوویت یونین

بھی دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یورپ کے کئی شہر اور مشرق بعید بھی جا چکا ہوں۔ صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد مرحوم کے ہمراہ مشرقی یورپ اور یوگوسلاویہ اور نائب صدر مسٹر پاٹھک کے ساتھ افغانستان اور خلیجی ممالک کے دورے کا موقع ملا۔

چونکہ شہر حیدر آباد کی وضعداری اور بھائی چارے کی روایات میرے نزدیک سب سے بلند مقام رکھتی ہیں، اس لیے میں پوری دیانت داری اور خلوص سے کوشش کرتا ہوں کہ "سیاست" کو صحت مند پرانی اور نئی قدروں کا ایک خوشگوار امتزاج بناؤں۔

اردو سے میری والہانہ محبت کو آپ میری مادری زبان ہونے کا سبب قرار دے لیں، لیکن میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ یہی وہ زبان ہے، جس نے ہمارے ملک میں مختلف تہذیبوں کو ملانے اور ان اقدار کو مضبوط بنانے کے عمل میں تیزی پیدا کی اور جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو بڑی آسانی سے قبول کر سکتی ہے۔ اسی لیے میں اس کی نشو و نما اور اس کے ارتقا کی ہر تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ ویسے مرکزی انجمن ترقی اردو کی نائب صدارت اور اپنی ریاست کی انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی پہلی عاملہ کے ایگزیکیٹو چیرمین کی حیثیت سے مجھے اردو اور اردو والوں کی خدمت گزاری کا شرف حاصل رہا ہے۔ اردو تعلیم کو عام کرنے کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے پرائمری سے ثانوی درجوں تک موڈل اسکول اور کوچنگ سینٹروں کے قیام کی جدّوجہد میں اپنے دوست احباب کے ساتھ کندھے پہ جھولی لٹکائے، ہر صاحب خیر سے اردو کے لیے اس کا حق صرف ایک روپیا مانگتا رہا ہوں۔

مجھے فخر ہے کہ میری اپیل رائیگاں نہیں گئی۔ میں نے ساڑھے تین لاکھ روپے کا تعلیمی ٹرسٹ بنایا ہے۔ جس کے منافع سے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام دو اردو ماڈل اسکول، اردو ہال اور اردو گھر میں کامیابی سے چلائے جا رہے ہیں۔ اردو مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ انگریزی، ہندی اور تلگو میں تعلیم کا کامیاب تجربہ جاری ہے۔

میں نے پہلے ہی بتایا ہے کہ میری تعلیم اس دور کے "نوابوں" کے طبقہ کی روایات کے مطابق انگریزی ماحول میں ہوئی تھی اور میں نے اپنی مرضی سے اچانک اپنا ذریعہ تعلیم بدل کر ملک کی پہلی اردو ذریعۂ تعلیم کی مادر جامعہ کو اپنایا تھا۔ اس لیے میں اردو میں کسی حد تک "ہمہ دانی" کا دعوا تو نہیں کر سکتا، لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو میرا ایمان ہے میرا سرچشمۂ وجدان ہے۔ اس وارفتگی نے شاید مجھ سے کچھ ایسے کام بھی کرائے ہوں جو میری بساط سے بہت بڑے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اردو کی اچھی تخلیقات کے لیے سرمایہ کی فراہمی ادیبوں اور لکھنے والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اردو کے شاعر و ادیب اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود افلاس کے دلدل سے نکلنے نہیں پاتے۔ ان کی امداد و اعانت کے لیے ادبی ٹرسٹ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ سرمایہ کہاں سے

آئے۔ لیکن جو تحریک پورے خلوص سے شروع کی جاتی ہے اس کے پھلنے پھولنے کی راہیں نکل ہی آتی ہیں۔ چنانچہ میری حوصلہ افزائی کرنے والے کچھ لوگ اور بھی مل گئے اور میں جو یکہ و تنہا ایک مشکل سفر پر چل پڑا تھا۔ بہت جلد اپنے آپ کو ایک کارواں کا جزو محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس ٹرسٹ کے کارپس کی فراہمی کے لیے ہر سال ایک کل ہند مشاعرہ کے انعقاد کا انتظام کیا ۱۰ سال قبل پہلا مشاعرہ ہی اپنے نظم و ضبط، ہندستان کے مشہور شاعروں کی شمولیت و شرکت اور اردو نوازوں کی اعانت سے بڑا کام یاب رہا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے اب سارے ملک میں مشہور ہو گئے۔ میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ان مشاعروں کو سننے کے لیے ایسے سرکاری حکام اور قومی قائدین بھی بے چین رہا کرتے ہیں، جنھیں اردو کی شاعرانہ نزاکت خیالی کو سمجھنا تو دور کی بات ہے، اردو زبان بھی نہیں آتی۔ اسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام اب تک آٹھ مطبوعات شائع ہو چکی ہیں اور شاعروں و ادیبوں کی بروقت امداد کے لیے زائد از دو لاکھ روپے جاری کیے گئے۔ اب ادبی ٹرسٹ کا کارپس ڈھائی لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ حکومت نے جناب اندر کمار گجرال (سابق سفیر ہند برائے سوویت یونین) کی صدارت میں گجرال کمیٹی کی تشکیل کی تو مجھے بھی اس کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ گجرال کمیٹی کی ضخیم رپورٹ اب تک منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔ تاہم میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اس کمیٹی کے اجلاسوں میں، میں نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھے بغیر اردو والوں کی انتہائی دیانت داری سے نمائندگی کی اور اس سیکولر زبان کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا۔ بعض ایسی تجاویز منظور کرانے میں کام یاب رہا جن کو نیک نیتی سے روبہ عمل لانے کی صورت میں مجھے یقین ہے کہ اردو والوں کے کئی مسائل طے پا سکتے ہیں۔

مجھے اردو والوں سے کوئی شکایت نہیں۔ کیونکہ ہر مرحلے پر مجھے ان کا اعتماد حاصل رہا ہے۔ اور "سیاست" کو محض ایک اخبار کی بجائے ایک ادارہ بنانے میں انھوں نے مجھے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا گراں بہا تحفہ دیا ہے، وہی اب میرا مقصود نظر بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب کے ادارۂ ادبیات اردو سے کون اردو داں واقف نہیں۔ اس عظیم ادارے کی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ سالانہ صرف ۴ ہزار روپے کی سرکاری گرانٹ پر یہ ادارہ چل رہا تھا۔ ادارے کے عہدے داروں کی خواہش پر میں نے ادبی ٹرسٹ کے ایک مشاعرے سے ڈیڑھ لاکھ روپے جمع اور حوالے کیے۔ جس سے ایک ٹرسٹ بنایا گیا۔ کارپس کی رقم سے سالانہ ۲۲ ہزار روپے آمدنی ہوتی ہے۔

پرانے شہر حیدر آباد میں جو مہاراجہ کشن پرشاد اور چندو لال شاداں کا شہر ہے۔ انجمن ترقی اردو کو ۲۰ سال قبل حکومت سے ایک قطعہ اراضی کا مل گیا تھا۔ پرانے شہر میں چونکہ اردو سرگرمیوں کے لیے کوئی مرکز نہ تھا، میں نے مشاعرہ اور عطیہ سے ۲½ لاکھ روپے کا ایک خوب صورت ہال تعمیر کروایا۔ جہاں آج شان دار لائبریری تعلیم بالغان کا مرکز ہے اور اب حیدر آباد کے ۹۰ فی صد جلسے اسی اردو گھر میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے

علاوہ اردو گھر کے اخراجات کی پابجائی کے لیے ایک لاکھ روپے کا ٹرسٹ بنایا۔

میں نے زندگی کے پچھے دہے مکمل کر لیے ہیں۔ زندگی کے نشیب کم اور فراز زیادہ دیکھے ہیں۔ مجھے اپنی ہی زندگی میں دین و دنیا کی تمام سہولتیں، اعزازات اور نیک نامی ملی ہے۔ ان بے شمار نعمتوں کے لیے میں جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کروں، کم ہے۔ زندگی کے اس آخری مرحلے میں؛ بچی کھچی سانسوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ وقت باقی رہا ہے، یہ کوشش ہے کہ وہ اردو کو اس کا مستحقہ مقام و مرتبہ دلانے کی جدّو جہد میں صرف ہو۔ میں نے ہمیشہ عدل اور انصاف اور میل و ملاپ کے راستے کو اپنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے قدم انشاء اللہ تعالیٰ نہیں ڈگمگائیں گے۔ (۱۹۸۷ء میں یہ تحریر لکھی گئی تھی)

(بشکریہ "آج کل" نئی دہلی مارچ ۱۹۸۷ء)

علی سردار جعفری
۱۰۔ سیتا محل۔ بومن جی
پیٹٹ روڈ بمبئی

عابد علی خاں ــــ شائستگی کا پیکر

ایک مینار نور تھا۔ موت کی ہوا نے اس کو بجھا دیا لیکن روشنی باقی ہے اس کی ہر کرن کہہ رہی ہے۔

ہرگز نہ مرد آں کہ دلش زندہ شد ز عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

عابد علی خاں مرحوم حیدرآباد کی تہذیب اور شائستگی کا مکمل پیکر تھے۔ ان کی خوش اخلاقی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیت میں ایک آہنی کردار کا انسان پوشیدہ تھا جس کی جھلک ان کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ ۱۹۴۹ء کے پر آشوب زمانے میں سیاست کا اجرا اور پھر اس کی سر بلندی ایک مرد مجاہد کے عزم و ہمت کی داستان ہے۔ حیدرآباد میں مرحوم عابد علی خاں کے اس اخبار نے صحافت کے آداب سکھائے اور نئی راہوں پر گامزن ہونے کا حوصلہ بخشا۔ اب یہ اخبار ایک ادارہ ہے اور مرحوم کی شاندار یادگار ہے۔ اس اخبار کے ذریعے سے انھوں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات انجام دیں۔

وہ ایک شفیق بزرگ خاندان اور ایک مہربان دوست تھے۔ اپنے عزیزوں کی دلداری اور دوستوں کی خدمت کرنے میں ان کو راحت محسوس ہوتی تھی۔ وہ نہ جانے کتنے حاجت مندوں کے کام آتے تھے اور کتنے ضرورت مندوں کی احتیاج پوری کرتے تھے۔ ان کا دست کرم ان کے دل کی طرح شریف اور وسیع تھا۔ دشمنوں کے ساتھ سلوک کرنے کا ایک عجیب انداز تھا۔ سیاست کے دفتر میں میرے سامنے کا واقعہ ہے ایک بد قماش شخص آیا جو مرحوم کو اپنا بدخواہ سمجھتا تھا حالاں کہ وہ خود بدخواہ تھا۔ عابد علی خاں مرحوم نے اس کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ "میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے باہر بھی علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔

مرحوم سے میرے مراسم بہت پرانے تھے۔ اب یہ بھی یاد نہیں کہ سب سے پہلے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً ۴۶۔۱۹۴۵ء میں ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد کانفرنس میں۔ اس کے بعد اکثر بمبئی اور دہلی میں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور پھر جب انھوں نے ادبی ٹرسٹ کے قیام

کے لیے مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا تو حیدرآباد میں یہ خوشگوار لمحے میسّر آتے تھے۔ ادب سیاست، اخلاق، شرافت، تاریخ، تہذیب ہر موضوع پر بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ اس گفتگو سے ان کے ذہنی افق کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ وقت اس طرح گزرتا تھا کہ ماضی حال اور مستقبل اس ایک لمحے میں تبدیل ہو جاتے تھے جسے عابد علی خاں سے ملاقات کا لمحہ کہنا چاہیے۔ انھیں حیدرآباد سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ جس شان سے حیدرآباد کے چارسو سالہ جشن منانا چاہتے تھے۔ وہ بوجوہ ممکن نہ ہو سکا (حالانکہ جشن منایا بھی)۔ ان کی تمنا تھی کہ حیدرآباد کی تہذیب اور تاریخ پر ایک خوبصورت ٹی وی سیریل بنے جو دہلی دوردرشن پر پیش کیا جائے۔ اس کے متعلق انھوں نے حکومت ہند کے وزیر نشرو اشاعت سے بات بھی کی تھی۔

انھوں نے میرے ساتھ مہمان نوازی کا فرض جس طرح ادا کیا ہے اس کے اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ڈیڑھ دو سال پہلے میں ٹیلی ویژن سیریل "کہکشاں" کی شوٹنگ کے لیے حیدرآباد گیا تھا۔ شوٹنگ جوش ملیح آبادی اور مخدوم محی الدین کی زندگی اور شاعروں کے متعلق تھی۔ میرے قیام و طعام سے لے کر شوٹنگ تک سارے انتظامات اس خوش اسلوبی سے کرائے کہ مجھے ذراسی دشواری محسوس نہیں ہوئی بلکہ بعض نازک مواقع پر وہ ایک زبردست سہارا بن گئے۔ میں اور میرے یونٹ کے سارے کارکن مرحوم کے شکر گزار اور احسان مند ہیں۔

میری آخری ملاقات دو ماہ پہلے حیدرآباد میں ہوئی جب ڈاکٹروں نے عابد صاحب کو کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ ایک طرح سے اپنے مکان میں قید تھے۔ دل کے کچھ حصوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور وہ آخری وقت کے لیے تیار تھے۔ ان کے چہرے پر سکون تھا اور مسکراہٹ پہلے کی طرح دلآویز تھی۔ دیر تک اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے رہے اور زندگی اور موت کے فلسفے پر اظہار خیال کرتے رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آخری وقت کے لیے تیار ہیں، بالکل راضی بہ رضا ہیں اور موت کے خیال سے خائف نہیں ہیں۔ کل رات ان کے انتقال کی خبر سن کر اقبال کا شعر یاد آگیا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

حیدرآباد اپنی ایک دولت سے محروم ہو گیا اور زندگی کی روشنی میں تھوڑی سی کمی آگئی۔

بعض تاریخی عمارتیں دیکھ کر گراں باری کا احساس ہوتا ہے جیسے ان کی عظمت سینے پر سوار ہے لیکن بعض عمارات جیسے لال قلعہ، تاج محل دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ کسی نے ان عمارتوں کو خوبصورت کاغذ سے تراش کر زمین کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہے۔ خوش منظر، نرم اور سبک۔ اس قسم کا احساس عابد علی خاں مرحوم سے مل کر ہوتا تھا جیسے وہ انسان کے پیکر میں ایک تاج محل ہیں۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
۱-۸-۹۹ - سورج نگر
حیدر آباد

عابد علی خاں

ایک شخص ہی نہیں، ایک ادارہ، ایک دور

میرے عزیز دوست اور رفیق عابد علی خاں کو مرحوم کہتے ہوئے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور کاغذ پر حروف مدھم ہونے لگتے ہیں۔

یہ سال ہی شہر حیدر آباد اور اس کے ادبی حلقوں کے لیے بالخصوص صبر آزما ثابت ہوا۔ حسینی شاہد، سری نواس لاہوٹی، عزیز قیسی، نرمل، فضل الرحمٰن صاحب اور اب ۱۲/نومبر ۱۹۹۲ء کو وقت فجر عابد علی خاں صاحب نے ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر داعئی اجل کو لبیک کہا۔

عابد ۱۹/مارچ ۱۹۲۰ء کو پیدا بھی بوقت فجر ہوئے تھے۔ نواب میر محمود علی خاں کے فرزند اور نواب انتخاب جنگ کے چہیتے پوتے تھے۔

جب ۱۹۴۹ء میں روزنامہ سیاست جاری کرنے کا ارادہ کیا تو خریدا تو "وجاہت پریس" تھا۔ لیکن اسے اپنے دادا کی یاد میں "انتخاب پریس" نام دیا۔ عابد کی ایک شخصیت ہی نہیں تھی وہ اپنی ذات میں خود ایک ادارہ تھے اور ایک دور کے نمایندہ تھے۔

ہم نے جاگیرداری دور کے تاریک پہلو کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ دیس مکھوں کے مظالم کا ان ہی کے طور طریقوں سے مقابلہ کیا ہے۔ لیکن جاگیرداری دور کی اگر تہذیبی درخشندگی دیکھنی ہو تو عابد علی خاں سے ملیے اور ملتے ہی رہیے۔ وضع داری، مسکراتا چہرہ اور کرسی سے اُٹھ کر احباب کا استقبال کرنا۔ حسب مراتب برتاؤ، رکھ رکھاؤ، گفتگو میں نرم لیکن عزم میں پختگی، کتنے گن گنوائے جائیں۔

عابد صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمان تھے لیکن کوئی غیر مسلم انھیں "مسلمان" نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سیکولرزم کا نمونہ تھے۔

عابد نے ۱۹۴۲ء میں گریجویشن کیا۔ جگر (محبوب حسین) ان کے جگری دوست اور رفیق کار تھے۔ سید عالم خوندمیری کی طرح عابد علی خاں بھی فلسفہ کے طالب علم اور خلیفہ عبدالحکیم کے شاگرد تھے۔ خلیفہ بائیں بازو کے رجحانات اور رواداری کے لیے مشہور تھے۔ عابد کو عابد بنانے

ہیں خلیفہ عبدالحکیم کی تعلیم کو اہم مقام حاصل ہے۔

پھر مخدوم سے دوستی، اور مخدوم جیسوں کا ساتھ۔ عابد کی ان سے دوستی نے غریب نواز اور سیکولر شخصیت کو اور بھی ابھارا۔

عابد شروع ہی سے ادب اور صحافت کی طرف مائل تھے۔ سرکاری نوکری ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد ہوئے اور ۱۹۴۵ء کی مشہور کل ہند کانفرنس میں زبردست کام کیا۔ جگر کی کاوشیں کچھ کم نہ تھیں۔ کرشن چندر نے اس کانفرنس کا جور پور تاژ "پودے" کے عنوان سے لکھا ہے اس میں جگر کی شخصیت کو خوب بیان کیا ہے۔

یہ کانفرنس اپنے شرکا اور اپنے مباحث دونوں کی حیثیتوں سے مشہور ہے۔ حسرت موہانی، احتشام حسین، سجاد ظہیر، قاضی عبدالغفار، وامق جونپوری، پریم دھون، فراق گورکھپوری، سردار جعفری اور کتنے ہی حضرات نے اس میں شرکت کی تھی۔ اسی کانفرنس میں جب سجاد ظہیر نے ادب میں عریانی کے خلاف تجویز رکھی تو آج کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو حیرت ہوگی کہ مولانا حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار نے اس کی مخالفت کی تھی اور سجّاد ظہیر کو اپنی تجویز واپس لینی پڑی تھی۔

ان حالات میں تکمیل تعلیم کے بعد عابد کا ادبی بپتیسما (BAPTISM) ہوا۔

جگر حیدر گوڑہ میں ایک گھر میں رہتے تھے۔ عابد کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں روپوش تھا۔ کباڑی گوڑہ سے گندی بستیوں اور نالیوں سے ہوتا ہوا۔ حیدر گوڑہ کی سڑک پر آیا اور سیدھے عابد کے پاس پہنچا۔ عابد اور جگر دونوں ہی نے بڑے چاؤ سے استقبال کیا۔ پھر میں نے کپڑے بدلے اور نکل گیا۔

پولیس ایکشن کے بعد جہاں حیدرآباد پر جمہوریت کی صبح نکل آئی وہیں مسلمانوں کو بڑے صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر کہیں وہ فرقہ وارانہ تعصب کا شکار تھے تو ساری ریاست میں جاگیرداری کے خاتمہ کی وجہ سے بے روزگاری میں بدحال تھے۔ سرکاری ملازمتوں کا میدان بھی تنگ ہو چلا تھا۔ ایسے میں ان کے "پرانے رہنماؤں" نے ایک ایک کر کے انھیں لاچار و بے بس چھوڑ کر پاکستان کی راہ لی۔ کچھ نوجوان بھی گئے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو حوصلہ دلانا، ہمت بندھانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

عابد نے ایسے وقت اپنے رفیق کار محبوب حسین جگر کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں روزنامہ سیاست نکالنے کا ارادہ کیا۔ ۱۵ اگست کو پہلا پرچہ شائع ہوگیا۔ عابد کو قاضی عبدالغفار کے اخبار "پیام" میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔ اخبار کے لب و لہجہ اور زبان کے دبدبے اور خیالات کے سلجھے پن کو عابد نے یہیں سے سیکھا۔ روزنامہ پیام کی پیشانی پر لکھا ہوتا۔

به آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
زما پیام رسانید ہر کجا ہستند

بس یہی وہ صحافتی سبق تھا۔ جو عابد نے قاضی صاحب سے سیکھا تھا۔ "سیاست" اگر تلخ نوائی

پر بھی اثر آتا تو اس وقت کے حالات ہی اس کے ذمہ دار ہوتے۔ لیکن مسیحائی اور تلخ نوائی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ "سیاست" نے "مسیحائی" کو اپنایا، زخموں پر مرہم لگایا، نشتر نہیں چلائے۔ اعتدال پسندی، جمہوریت پسندی، آزادی کی پرستش اور قومی یکجہتی کو پروان چڑھانا ہی عابد کا مقصد حیات اور منظور صحافت تھا۔ امن ان کا ایمان تھا۔ اس لیے "سیاست" کی پیشانی پر امن اور پیام رسانی کی علامت "کبوتر" بنا ہوا ہے۔

عابد نے صحافت ہی میں کٹھن زمانے میں صلح پسندانہ رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ ہوئے بنا انھوں نے عوام دوستی کا پیام ہی پہنچایا۔

آج مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کی "سیاست" ایک عادت ہی نہیں، بلکہ ایک کمزوری بن گیا ہے۔ اور یہ عابد کا کارنامہ ہے۔

پھر عابد نے صحافت کی جو خدمت کی وہ تو کی۔ اردو کی جو خدمت کی ہے وہ اپنی جگہ آپ مثال ہے۔ اردو صحافت کو ان کی دین، ادبی ٹرسٹ کا قیام، انجمن ترقی اردو سے ان کی وابستگی، اردو کالج، اردو ماڈل اسکولوں کا قیام، اردو تعلیمی ٹرسٹ، پرانے شہر میں اردو گھر کی تعمیر، نگراں کمیٹی کی رکنیت اور اس کی سفارشات سے ان کی گہری وابستگی، ترقی اردو بیورو کے مشاورتی اداروں سے ان کا رشتہ، غرض کتنے کام بتائے جا سکتے ہیں جو انھوں نے اُردو کے لیے کئے۔

ادبی ٹرسٹ کا سالانہ مشاعرہ تو ایک اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ہر سال منعقد ہوتا ہے اور اس سے ٹرسٹ کو ہی نہیں مختلف اداروں میں زیر تعلیم مستحق طلبہ کو امداد بھی دی جاتی ہے۔ غرض عابد کو جو بھی جانتا ہے وہ انھیں مانتا بھی ہے اور یہ سب کی قسمت نہیں۔

سید ہاشم علی
۲۳ سری نگر کالونی
حیدرآباد۔ ۵۰۰۸۷۳

اردو صحافت کا محسن

عابد علی خاں نے اپنی زندگی ہی میں ہندستان کی دنیائے صحافت، اردو کی بے مثال خدمت گزاری اور حیدرآباد کی سماجی زندگی میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا کہ ان کے نام کے ساتھ جناب اور صاحب استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسی فعال اور قدآور شخصیتوں کا کام ہی ان کی بڑائی کا مظہر ہو جاتا ہے۔ ان کی وصیت نے ان کے بڑے ہونے کی تصدیق کردی۔ اس طرح وہ زندگی اور موت دونوں میں عظیم ثابت ہوئے۔ اپنی موت کے بعد وہ نہ تعزیتی جلسے چاہتے تھے نہ سنگ مزار۔ محض دعائے خیر ان کی آخری خواہش تھی۔

نظام ششم کے ہم جماعت اور نظام ہفتم کے اتالیق نواب انتخاب جنگ بہادر کے پوتے اور نواب محمود علی خاں کے صاحبزادے، عابد علی خاں نے جاگیردارانہ ماحول میں پیدائش اور پرورش کے باوجود آباء و اجداد کی روش سے ہٹ کر قدامت پسندی اور رواج پسندی کے دستور زندگی سے آزادی حاصل کی اور امیروں کی روش اور طینت سے گریز کیا۔ جہاں مشقت اور محنت، تعلیم اور ہنرمندی کو بے ضرورت سمجھا جاتا تھا اور تن آسانی اور بے کاری ہی کو زندگی سمجھا جاتا تھا۔ اپنے لیے ایک نئی اور دشوار گزار زندگی اختیار کی جو حیدرآباد میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد انتہائی غیر یقینی ہو گئی تھی۔

حیدرآباد کی ایک شائستہ اور مخصوص طرز زندگی تھی۔ ایک ایسی تہذیب نے یہاں جنم لیا تھا جس میں خوش اخلاقی، مہمان نوازی، بے تعصبی، مذہبی رواداری اور انسانیت کی وہ ساری خصوصیات جو ہندستان کے تمام مذاہب کے اعلا اقدار کے امتزاج سے پیدا ہو سکتی تھیں اس میں موجود تھیں اور شاید اسی لیے فانی نے کہا تھا کہ دکن آنے کے بعد انھیں پتا چلا کہ وہ ہندستان میں رہتے ہیں ہندستان سے دور۔ اسی تہذیب کے بارے میں MEILON TAYLOR نے کوئی سو سال قبل کہا تھا کہ حیدرآباد آنے کے بعد اسے ہندستان میں پہلی مرتبہ ایک نہایت ہی اونچے درجے کی شائستہ اور مہذب ہندستانی سوسائٹی سے سابقہ پڑا۔ آزادی سے دو سال قبل حیدرآباد کے سیاسی حالات میں جو تبدیلی آئی اور پولیس ایکشن کے بعد جو انقلاب آیا اس کا پہلا

نشانہ بھی تہذیب تھی لیکن آزادی کے پینتالیس سال بعد تک عابد علی خاں اسی تہذیب کا ایک بہترین نمونہ بنے رہے اور باہر سے آنے والوں کے لیے ان کا گھر اور دفتر اسی پرانی تہذیب کی زیارت گاہ کا کام کرتے رہے۔

جامعہ عثمانیہ میں وہ میرے ہم عصر تھے اور اقامت خانہ عارضی میں ان کا اور محبوب حسین جگر کا ساتھ رہا۔ عام جاگیر دار لڑکوں کی طرح ان میں نہ کبر و نخوت تھی نہ نزاکت و نفاست کا بے جا اظہار۔ ان کی سادگی طبع، خوش اخلاقی، منکسر مزاجی اور مہذب اور باوقار طرز زندگی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ اپنے قابل اور بلند پایہ اساتذہ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر شیو موہن لال اور میر ولی الدین صاحبان سے انھوں نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور آج کل کے طالب علموں کی طرح وقت گزاری نہیں کی۔ گریجویشن کے بعد وہ جمہوری اور ترقی پسند تحریکوں سے وابستہ رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد رہے۔ کچھ عرصہ سرکاری ملازمت بھی کی لیکن ۴۷ء میں استعفا دے کر ۱۵ اگست ۴۹ء کو اخبار سیاست شائع کیا۔ ان کے پہلے اداریہ سے ان کی شخصیت، ان کے مشن اور مقصد حیات کی ایک جھلک ملتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہیں زندگی کے قافلے میں درماندہ راہ رووں کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں..... سیاست اس دور میں باہمی رواداری اور صحت مند جمہوری رجحانات کے فروغ و ارتقا کے لیے اپنا مقدس فرض ادا کرے گا۔ سیاست اپنے ماتھے پر کوئی قشقہ لگائے بغیر ابھی ذات سے کسی تحریک کو وابستہ کیے بغیر اداروں اور جماعتوں کی وابستگی کے طوفان اور آندھی سے اپنا دامن بچا کر دکھی انسان اور انسانیت کا ساتھ دے گا جس کا مذہب پہچانا نہیں جاتا جو صرف انسان ہے مذہب نہیں، کوئی تحریک نہیں، کوئی جماعت نہیں، ان مقاصد کے ساتھ آپ کی بزم میں حاضر ہوا ہوں اور مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ سپیدہ سحر کو دیکھ رہا ہوں اور سیاست میں ان ہی کرنوں کا نور بکھیرنا چاہتا ہوں ۔"

عابد علی خاں ۴۳ سال تک یہ نور بکھیرتے رہے۔ دکھی انسانوں اور انسانیت کی مدد کرتے رہے۔ اردو کی بے مثال خدمت کرتے رہے۔ دکھی اردو کو ادارہ ادبیات میں انجمن ترقی اردو اور اردو ہال میں، اردو گھر، اردو کالج میں، ادبی ٹرسٹ میں اور کہاں کہاں سر چھپانے کی جگہ دیتے رہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کی مدد کرتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے ماضی کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش میں بڑے ممد و معاون رہے۔ اردو صحافت کو سنسنی خیز، اور ردعمل کی صحافت کی بجائے صائب الرائے، اعتدال پسند طرز بیان، مثبت اور تعمیری طرز فکر کی علامت اور فرسودگی، جہالت، انتہا پسندی اور قدامت پرستی کے خلاف جہد مسلسل، یک جہتی اور رواداری کے پیغام بر بنانے کے لیے اپنے شخصی اوصاف کے موثر استعمال میں کامیاب رہے۔ اردو معاشرہ کو ذمہ دار بنانے کا کام کیا۔ ملک کے ماضی کے روشن پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ مختلف ادوار میں اخبار میں نئے نئے فیچرس شامل کرکے اس

کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی کوشش کی۔ سیاست کو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کا نمایندہ بنایا۔ ہفتہ وار اڈیشن کو اس قدر ہر دلعزیز بنایا کہ سارے برّ اعظم میں اس کے پڑھنے والے موجود ہیں۔

زبان کی شایستگی، سرخیوں کی سنجیدگی، مضامین کا تنوع اور جدید ترین طریق طباعت کے امتزاج سے سیاست کو ایک قابل رشک ادارہ، ایک کلچر اور تہذیب کا نمایندہ بنادیا۔

تاریخ انھیں اردو کے چاہنے والوں، خادموں اور محسنوں میں ایک ممتاز مقام دینے پر مجبور ہوگی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی
درگاہ حضرت نظام الدین
نئی دلی

اِک روپ جھلک

آنکھیں بڑی۔ دہانہ چوڑا۔ ہونٹ رنگین۔ پان کی لالی سے کم سگرٹ کے دھوئیں سے زیادہ۔ پیشانی کشادہ روشن اور ٹوپی کی سرپرستی سے بے نیاز۔ مگر تن نازک جب دیکھو شیروانی کا نیازمند۔ قد ایسا جیسے بوٹا سا کہیے۔ لیکن وہ بوٹا جس کے اندر ایک اونچا گھنیرا، چھتنار درخت چھُپا ہو۔ سایہ دار بھی، پھل دار بھی اور سر بلند بھی۔

اردو کی ترقی پسند تحریک سے عابد علی خاں صاحب کی وابستگی کا حال مجھے بہت دن بعد معلوم ہوا۔ اوّل اوّل انھیں ایک خانقاہ کی نسبت سے جانا کہ وہ حضرت شاہ صابر حسینی سجّادہ نشین درگاہ حضرت شاہ خاموش" کے داماد ہیں۔ یا حیدرآباد کی بعض دعوتوں پارٹیوں میں لوگوں نے انھیں "عابد نواب" کہہ کر مخاطب کیا تو سمجھا کہ حضرت صابر حسینی کی صاحبزادی کسی جاگیر دار سے بیاہی گئی ہیں۔ تھوڑی واقفیت سے بعض اوقات غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرے میرے ذہن میں بھی ان کی پہلی تصویر ادھوری اور کسی قدر غلط بن کر آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے دنیا کا سارا کارخانہ نوابوں اور جاگیرداروں ہی کے سپرد کر رکھا تھا اور اس طبقے نے بڑی عظیم ہستیاں پیدا کیں تھیں۔ نیز خانقاہیں بھی کسی زمانے میں ایسی تھیں جہاں نہ جمود کا نام تھا نہ فرسودگی جگہ پاتی تھی مگر رفتہ رفتہ جاگیریں کاہلوں اور نکموّں کی جاگیر ہوگئیں اور خانقاہوں میں پیر طریقت اور شیخ وقت کا نہیں مریدوں اور عقیدت مندوں کا سکّہ چلنے لگا۔ یہ لوگ اپنے جوان جہاں پیروں اور پیرزادوں کے جسم پر بھی بوڑھے چولے دیکھنا پسند کرتے تھے اور ان کی تسکین کا سامان بس یہ رہ گیا تھا کہ خانقاہیں جِدّت پھرت سے خالی ہوں۔ اور ان کی چھتوں پر کہرا۔ دیواروں پر کائی اور حجروں میں لوبان کی ایسی دھونی رمائی جائے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے! پھر جیسی طلب ویسی رسد۔ اچھے اچھے لوگ شرما حضوری زمانے کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے۔

ہرچند کہ عابد علی خاں صاحب ایک روشن خیال اور روشن نظر خانقاہ کے داماد تھے اور ان کے بڑے برادر نسبتی حضرت قطب میاں صاحب نے خانقاہ کے سجادے کے ساتھ کلکٹر کی کرسی کو بھی رونق بخشی تھی اور ان سے چھوٹے برادر نسبتی حضرت فرید میاں نے

ذکر و شغل کی مشق کے ساتھ نظام حیدر آباد کے "صرفِ خاص" کے اہتمام کی مشقت بھی سہی تھی۔ تاہم یہ کیا ضروری ہے کہ کسی خانقاہ میں سب افراد ایک جیسے ہوں۔ خاص کر وہ داماد جو نواب بھی ہوں اور چھاپے خانے اور اردو اخبار کے مالک بھی! خبر نہیں کیوں۔ چھاپے خانے کے ساتھ میرے دماغ میں کالک کا تصور آتا تھا اور اردو اور اس کا اخبار اور پھر اس اخبار کا دفتر، یہ سب تو مجھ ہی کو کیا شاید ہر ایک کو عاشقی اور شاعری اور بے ترتیبی یاد دلاتے ہیں! مگر پھر ایک کاروباری ضرورت سے اخبار سیاست کے دفتر اور پریس جانا پڑا جہاں عابد علی خاں صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ قریب سے دیکھنے پر ان کی دنیا کچھ اور ہی نظر آئی۔ نہ کاہلی نہ کُہرا نہ دھواں نہ کالک نہ فرسودگی نہ بے ترتیبی۔ سیاست کا سا چھاپے خانہ تو میں نے انگریزی اخباروں کا بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری۔ سجی بنی۔ نِک سُک سے درست در و دیوار، زمین و آسمان سب سے خوش حالی اور بلند اقبالی نمایاں۔

یہ دوسری تصویر پہلی تصویر یا تصور سے بالکل مختلف پائی۔ مگر واقفیت اب بھی مکمل نہیں تھی۔ اس لیے پھر غلط فہمی پیدا ہوئی کہ فی زمانہ نہ تو مسلمانوں میں ایسے اولوالعزم پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ نہ ہندستان میں کوئی کارخانہ یورپ و امریکا کے انداز کا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے عابد علی خاں صاحب مسلمانوں میں کیسے موجود ہیں اور ان کا کارخانہ ہندستان میں کیونکر ہے، اگر عابد علی خاں صاحب واقعی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے تو اب تک آنکھوں سے اوجھل کس طرح رہے؟ اور ان کے سے اعلا طباعتی اور اشاعتی کارخانہ جات بھلا ہمارے پیارے الھڑ ہندستان میں کیوں ہونے لگے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں پر اعتبار کریں، یہ تو خود ہندستان کا ہندستان میں پردیسی ہونا ہو گیا!

میں خیالات کے اس طلسم میں الجھا ہوا تھا کہ ایک ساتھی نے چونکایا اور کہا کہ اس نئی دنیا کے چلانے والے دراصل محبوب حسین جگر ہیں۔ ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بھائی جگر! مگر میں نے بے اختیار کہا کہ حضرت جگر اس جگہ کے ابدال قطب جس قدر بھی ہوں اور خوش عقیدہ لوگوں کے خیال کے موافق اس دنیا کے انتظام و انصرام کی ڈوریاں چاہے جس طرح ہلاتے ہوں۔ لیکن اس کا "کُن فیکون" تو اللہ میاں نے عابد علی خاں صاحب ہی سے کرایا ہوگا۔ پھر انھیں داد کیسے نہیں ملے گی!

ظاہر باطن میں بھید بھاؤ برتنے والے کچھ ہی سمجھتے ہوں۔ مجھے تو ہر صاف ستھرا نستعلیق آدمی اندر سے بھی پاک اور پوتر محسوس ہوتا ہے اور اس کی کاروباری جگہ سلیقے کی ہو تو معاملات کا بھی کھرا لگتا ہے۔ تجربے نے عابد علی خاں صاحب کی ایک اور خوبی یہ دکھائی کہ وہ دل کے بھی بڑے ہیں۔ کاروباری آدمی اگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھتے رہنے کی عادت نہ ڈال لے تو اس کا کاروبار چوپٹ ہو جائے یا ترقی نہ کرے۔ دوسری طرف یہ مشکل کہ چھوٹی چیزوں کو دیکھنا سیکنڈ

نیچر اور طبیعت ثانی بنے۔ تو آدمی خود چھوٹا ہو جائے۔ اس لیے وہ کاروباری لوگ جو باریک بینی کے عادی ہونے کے باوجود وسیع النظر اور دل کے بڑے ہیں۔ خصوصی تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں میں عابد علی خاں صاحب کو اونچے مقام کا مالک سمجھتا ہوں۔

میں نے جب جب مرحوم کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے میری درخواست کو شرف قبول عطا فرمایا، اور پھر ہزار اصرار کے باوجود نہ کبھی آمد و رفت کا کرایہ لیا۔ نہ ہوٹل کے بل میں دخل انداز ہوتے دیا نہ یہ بات مانی کہ غریب خانے پر قیام فرمائیں۔ اس کے برعکس خود حیدرآباد بلاتے تو بیٹی کی شادی تک میں دعوت نامے کے ساتھ ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھتے۔

عابد علی خاں کی عظیم شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ میں انھیں رائٹر، صحافی، منتظم، کامیاب تاجر اور ماہر آجر ENTREPRENEUR کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ لیکن ان کی زندگی کے ان پہلوؤں میں سے ہر پہلو صرف پہلو نہیں ایک آدمی لگتا تھا۔ پورا، کامل اور مکمل آدمی! ان کی ذات میں واقعی کئی آدمی جمع تھے اور وہ اکیلے دنیا سے نہیں گئے ہیں کئی اور آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ہیں۔ ان کی موت نے دنیا کو ایک آدمی سے سُونا نہیں کیا ہے۔ کئی آدمیوں سے سُونا اور محروم کیا ہے۔

مرحوم کی صحافتی زندگی کے بارے میں کبھی بطور خاص کچھ سوچا نہیں تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے سنسنی خیزی کو اپنائے بغیر ایسی زبردست کامیابی کس طرح حاصل کی۔ سنسنی اخباری دنیا کا سکہ رائج الوقت ہمیشہ سے ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خاں انگریزی اخبار بھی ہر وقت چونکا دینے والی اسٹوری اور کہانی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لیکن "سیاست" وہ واحد اخبار نظر آتا ہے جو سنسنی کے ذریعے عارضی مقبولیت کے پیچھے کبھی نہیں پڑا۔ اس نے اپنی ان تھک محنت سے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اس حلقے کا ذوق بھی بنایا۔ اس حلقے کو واقعی سنسنی سے زیادہ نئی، مکمل اور بھروسے کی خبروں سے دلچسپی رہی اور عابد علی خاں صاحب کے سادہ مگر پرکار اسٹائل نے اُن کا دل موہ لیا۔

مرحوم اس لحاظ سے بھی اردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں مقام پائیں گے کہ انھوں نے طویل مدت تک بڑے ٹھہراؤ اور وضع داری کے ساتھ اپنی پالیسی کو قائم اور جاری رکھا۔ ان کی پالیسیاں صبح شام نہیں بدلیں۔ ان کے ہاں کوئی تبدیلی آئی بھی تو اس نے قلابازی کی شکل اختیار نہیں کی بلکہ ربط و تسلسل کے ساتھ شریفانہ اور باوقار انحراف کی شان دکھائی گئی۔ ان پر سرکار سرپرستی کی تہمت تو دھری گئی لیکن دلچسپ تماشا یہ تھا کہ کسی بھی تہمت لگانے والے نے اس سرکاری درباری اخبار کو پڑھنا نہیں چھوڑا اور یہ بات ثابت ہو کر رہی کہ عابد صاحب مرحوم کے ہاں کوئی کشش ایسی ضرور ہے کہ اختلاف

رکھنے والے بھی ان کے ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جس کے ساتھ دنیا چلے اس کے ساتھ دنیا سے فائدہ اٹھانے والے کیوں نہ چلیں؟ سیاست کی مقبولیت اور عابد علی خاں صاحب کی ترقی کا راز شاید یہی تھا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون کا نام اردو کے مشہور ترین صحافیوں میں آتا ہے۔ انھوں نے اپنی زرد صحافت کو احترام عطا کرنے کے لیے لکھا تھا کہ دوسرے اخبار والے قصیدے پڑھ کر فائدے حاصل کرتے ہیں اور میں پولیس کے تھانے دار کی طرح رقمیں وصول کرتا ہوں اللہ کا شکر ہے کہ عابد علی خاں صاحب جیسے لوگوں نے اردو صحافت کو بھٹی اور تھانے داری کے چکر سے نجات دلائی، اور فنی مہارت، مستقل مزاجی اور انتھک محنت کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ انھوں نے اپنے اخبار سیاست کو ایک مقناطیس بنائے رکھا جس کی طرف محتاج اور مختار سب کھنچے چلے آتے تھے اور وہ دولت جس کے لیے دنیا میں اتنی چیخ و پکار ہے عابد صاحب پر بن مانگے برستی تھی۔

میں نے عابد صاحب کو دوستوں کا دوست دیکھا اور کبھی کبھی یہ شان بھی نظر آئی کہ ایک چھوٹا سا ہیرا نما آدمی اپنی بھاری بھرکم آواز کے ساتھ تحکمانہ گرج رہا ہے اور الفاظ اس کے ہونٹوں پر فیصلے بن کر نمودار ہو رہے ہیں۔ چھوٹے اپنی ضرورتیں اس کے پاس لا رہے ہیں اور بڑے اپنی مشکل کشائی کے لیے اس کے ہاں حاضر ہیں ذاتی معاملات ہیں، سماجی معاملات ہیں، سیاسی معاملات ہیں، نوعی معاملات ہیں کہیں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ اگر وہ کسی ولایت کا مالک ہے تو اس ولایت کا کوئی دور دراز کونا بھی ایسا نہیں جہاں اس کا فرمان جاری و ساری نہ ہو۔ اس کی رائے کا وزن حیدرآباد اور آندھرا ہی میں نہیں ہے دہلی کا ایوان اقتدار بھی اس کی بات سننے کے لیے کان لگائے رکھتا ہے۔ نہایت شائستہ، نہایت ملنسار، بہت ہی خلیق۔ واقعی ایک بڑا انسان! زاہد میاں، شاہد میاں خوش قسمت ہیں کہ عظیم باپ کی وراثت کے ساتھ ایک تابناک روایت بھی انھیں ملی ہے۔ خدا اس روایت کو قائم رکھے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی
شعبۂ عربی دہلی یونی ورسٹی
دہلی ۷

عابد علی خاں

بیابان کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

موت ایک حقیقت ہے، زندگی کا ناگزیر انجام ہے، یہ نئی نسل اور نئے افکار کے لیے راستہ بناتی ہے، اس طرح تغیرات کا یہ کارخانہ بھی چلتا رہتا ہے، مگر کبھی دستِ بیداد اجل ایسے افراد کو بھی اُچک لیتا ہے جو ہزاروں کی دست گیری کرتے ہیں، لاکھوں انسانوں کا درد اپنے سینے میں چھپائے ہوتے ہیں، جن کا جینا اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے بندگانِ خدا کی موت بہت سے دوسرے درماندہ لوگوں کو نیم جان بنا جاتی ہے، اس لیے ان کی جدائی کا گھاؤ زیادہ گہرا اور اذیت دینے والا ہوتا ہے۔

جناب عابد علی خاں مرحوم و مغفور ایک ایسی ہی نادر روزگار شخصیت تھے:

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

وہ خود نہیں گئے، اُن کے ساتھ اور بہت کچھ چلا گیا، وہ سراپا چلا گیا جو کبھی بخت و اتفاق سے کسی شخصِ واحد میں جمع ہوتا ہے۔ مختصر سے قد و قامت کا یہ خوش خو شگفتہ رو انسان سراپا اخلاص و عمل تھا، نہ کوئی ریاکاری، نہ بلند بانگ دعوے، نہ شہرت و خود نمائی کی ہوس، نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ اللہ نے اسبابِ معیشت میں سب کچھ دیا تھا، مگر اس نے اپنے لیے مومنانہ سادگی کو پسند کیا۔ حیدرآباد کے جاگیردار خانوادے کی اولاد ہوتے ہوئے بھی نہ لباس میں کوئی غیر معمولی بات تھی، نہ کھانے پینے میں تکلفات تھے، اُن کی اپنی ضروریات محدود تھیں ساری صلاحیتیں اس لیے وقف تھیں کہ وہ غریبوں، مسکینوں، دردمندوں کے کام آسکیں اپنے ماحول سے غریبی، جہالت، توہّم پرستی، مذہبی منافرت کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنے وسائل اور قوتوں کو کام میں لاسکیں۔ اس جذبے کی قدر و قیمت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُنھیں کام کرنے کے لیے کیا ماحول اور کون سا زمانہ ملا تھا۔ انھوں نے ریاست کا عہد ختم ہونے کے بعد اپنا کام شروع کیا، اور اپنی زبان و قلم سے، اعمال و افعال سے، سماجی تعلقات سے مسلسل یہ کوشش کرتے رہے، کہ معاشرہ میں توازن رہے، ذہنوں میں کشادگی پیدا ہو، حوصلے بلند اور فراخ ہوں، ماضی کی اچھی اور صحت مند روایتوں کا تحفظ کیا جائے، مگر نگاہ مستقبل کی طرف رہے اور قدم آگے کی جانب بڑھتے رہیں۔ اگر ان کا مقصد صحافت کے ذریعے دولت ہی کمانا ہوتا تو گرما گرم

خبریں، "سنسنی خیز" تبصرے اور زہر آلود اداریے چھاپ کر شاید اپنے اخبار کی اشاعت اور بھی زیادہ کر سکتے، مگر اس کا نتیجہ سماج میں تاراج اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اہلِ دل کا قول ہے کہ اس دنیا کا کارخانہ چند نیک دل، نیک کردار اور پاکباز لوگوں کے وجود سے چل رہا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر چند دنیا میں اشرار کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور ان کی شیطانی حرکتیں مسلسل جاری ہیں، مگر دنیا کا توازن بگڑتا نہیں، کچھ دیر کے لیے اتھل پتھل ہوتی ہے پھر کارخانۂ عالم اپنی معمولی رفتار پر آجاتا ہے۔ اشرار کی فساد انگیزیاں سب کو نظر آتی ہیں اور خوب شور و شر پھیلاتی ہیں، مگر ابرار کی نیکیاں خاموشی سے کام کرتی ہیں اور اس آگ پر پانی ڈالتی رہتی ہیں۔ عابد علی خاں انھیں "ابرار" میں سے تھے جو نفرت کے ماحول میں محبت کا نغمہ گاتے ہیں۔ جب دوسرے کانٹے بچھا رہے ہوں تو وہ پھول برساتے ہیں اخوانِ شیاطین ہر طرف آگ لگا رہے ہوں تو وہ بارانِ رحمت بن کر چھا جاتے ہیں۔ اس میدان میں انھوں نے جو کام کیا وہ ایک خاموش جہاد تھا اور اس کا اجر اللہ کے وعدے کے مطابق بے حساب ہے۔

ہندستان میں کہیں بھی فساد ہوتا اور اس سے جان و مال کا نقصان ہوتا تو عابد علی خاں کی روح زخمی ہو جاتی تھی، وہ اپنے اخبار کے ذریعے ان مظلوموں کی امداد کرنے کی اپیل کرتے تو اندرونِ ملک سے، اور باہر سے بھی، سیاست کے قاری اپنے عطیات بھیجنا شروع کرتے، سیاست میں روزانہ کی آمدنی کا پائی پائی کا حساب چھاپا جاتا، اور آخر میں سب اکاؤنٹ آڈٹ کرا کر اس کا فوٹو بھی اخبار میں شائع ہوتا۔ اتنا اہتمام کسی دوسرے نے کبھی نہیں کیا، بعض جماعتوں نے برسوں تک لاکھوں روپیہ چندہ جمع کیا اور کبھی ایک پیسے کا قوم کو حساب نہیں دیا۔ اس لیے کہ شاید انھیں "یوم الحساب" پر یقین نہیں تھا۔ عابد علی خاں کی اس وضعِ احتیاط نے ان کا ایسا بھرم قائم کر دیا تھا کہ ان کی ایک آواز پر چاروں طرف سے لبیک کی صدا آنے لگتی تھی۔

وہ نہ جانے کتنے غریبوں، مسکینوں، دردمندوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے رہتے تھے، اس کا اندازہ اُن کے قریب رہنے والوں کو بھی نہ ہوتا تھا کسی بھوکے کو کھانا کھلانا یا ننگے کو لباس پہنانا بھی بہت بڑا اور نیک کام ہے، مگر عابد علی خاں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ نیک کام کیے جن کی اہمیت غور کرنے سے ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ہمارے سماج میں کتنے ہی پریشان حال افراد ہیں جو اپنے افلاس کی وجہ سے اور کچھ سماجی برائیوں کے سبب سے ازدواجی زندگی سے محروم رہ جاتے ہیں، لڑکی گھر میں سیانی ہو تو ماں باپ کا خون سوکھتا رہتا ہے، غریب آدمی گھوڑے جوڑے کی رقم کہاں سے لائے اور یہ نہ ہو تو غریب کی جوان بیٹی کہاں جائے؟ اسی افلاس کے نتیجے میں حیدرآباد کی ہی ایک بچی امینہ کا افسوسناک واقعہ سامنے آچکا ہے۔ اسی طرح ایک مفلس انسان جو رکشہ چلاتا ہے یا سامان ڈھوتا ہے، یا چھوٹی موٹی نوکری کرتا ہے، اسے صرف اتنی آمدنی

ہوتی ہے کہ دو وقت روکھی سوکھی روٹی کھا سکے، وہ ازدواجی زندگی کا خواب ہی دیکھتا رہتا ہے اور اسی حسرت میں اُس کی جوانی کے پھول مرجھا جاتے ہیں، عابد علی خاں نے حیدر آباد میں اجتماعی شادی کی بنیاد ڈالی، کتنی ہی غریب بچیوں اور نادار جوانوں کو ازدواجی زندگی کی مسرت سے ہم کنار کیا، اس میں ایک شادی پر تقریباً ۲۰ ہزار روپے خرچ ہوتا تھا اور ایک وقت میں ۲۵۔۳۰ جوڑوں کو نئی زندگی کا حوصلہ دیا جاتا تھا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

انھیں اپنی تہذیب و ثقافت سے، زبان و ادب سے، اسلاف کی صحت مند روایات سے بھی گہرا تعلق تھا۔ اُنھوں نے حیدر آباد کی قدیم تاریخ اور تہذیبی مظاہر پر سیاست پر اتنا مواد چھاپ دیا ہے کہ آنے والی صدیوں میں بھی جب کوئی حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی تہذیب و ثقافت پر کام کرنے بیٹھے گا، تو اخبار سیاست کے فائلوں میں اُسے سب سے زیادہ مواد ملے گا۔ انھوں نے مضامین اور دستاویزیں ہی نہیں چھاپیں راجا دین دیال کی تصاویر کا ذخیرہ بھی مدت تک سیاست کے صفحات کی زینت بنتا رہا۔

حیدر آباد میں وہ ادبی ٹرسٹ کے بانی تھے، اس کے اہتمام سے ایسے شاندار مشاعرے کیے جن کی سارے ہندستان میں دھوم ہے۔ ان مشاعروں میں لاکھوں کا مجمع ہوتا تھا، اور ٹکٹ کی آمدنی بھی اتنی ہوتی تھی کہ مہمانوں کی اچھی خاطر مدارات کے بعد ایک معقول رقم کبھی کسی کالج کو، کبھی کسی اور رفاہی ادارے کو بطور امداد دے دی جاتی تھی۔ اسی طرح وہ یومِ قلی قطب شاہ کی روح و رَواں تھے، اور اس سالانہ پروگرام کو اُنھوں نے اتحادِ قومی کی علامت بنا دیا تھا۔

عابد علی خاں باتیں اور تقریریں نہیں کرتے تھے، عمل میں اور واضح نتائج میں یقین رکھتے تھے، اس لیے وہ کھوکھلے کاموں میں نہ دخل دیتے تھے، نہ اُن سے تعاون کرتے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد کی سالانہ نمائش میں اردو کتابوں کا بھی اسٹال لگانا شروع کیا اور تمام ناشرینِ اردو کو دعوت دی کہ وہ اپنی مطبوعات نمائش میں فروخت کے لیے بھیجیں۔ اس کا نتیجہ حیرت انگیز حد تک خوشگوار ظاہر ہوا، اور اتنی کتابیں فروخت ہوئیں جتنی اس سے پہلے کبھی کسی نمائش میں نہ ہوئی تھیں، یہ اردو زبان و ادب کی سچی اور عملی خدمت تھی، بقول اکبر الہ آبادی ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق ہے جو کہنے والے کرنے والے میں

اردو کی خدمت کے جذبے نے اُن سے اردو گھر تعمیر کروایا، جس کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ان کا کام تھا اس میں ایک اچھی لائبریری قائم کی، مختلف اوقات میں جلسوں اور ادبی لکچروں کا اہتمام کیا۔ ایسے جلسوں میں اپنی ساری مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر وہ خود شریک ہوتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ کسی طرح کی بدنظمی یا بدسلیقگی کا مظاہرہ نہ ہو۔

انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم حاصل کی تھی یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی مادری درسگاہ کی کوئی خدمت نہ کرتے۔ انھیں وژن آف عثمانیہ (VISION OF OSMANIA) کا خیال آیا، تو یونی ورسٹی کے صاحبانِ اقتدار کے تعاون سے کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ میں ایک ہال اس کے لیے مختص کرایا اور وہاں جامعہ عثمانیہ کی پوری تاریخ کو در و دیوار پر سجا دیا۔

بنیادی طور پر وہ ایک اہلِ قلم اور صحافی تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں وضاحت اختصار، سنجیدگی اور شائستگی نمایاں اوصاف ہیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انھوں نے اپنے اردو اخبار کا جو وقار بنایا وہ بھی غیر معمولی کارنامہ ہے۔ کسی مسئلے پر اعتدال اور توازن کا دامن انھوں نے کبھی ہاتھوں سے نہیں چھوڑا، اخبار کو بلیک میلنگ یا استحصال کا ذریعہ نہیں بنایا، نہ خبریں اس انداز سے شائع کیں جن سے "سنسنی" پھیلے۔ سیاست کے اداریے کسی مفکرِ سیاسیات کے قلم سے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ واحد اخبار ہے جس میں انھوں نے ملک بھر کے نامور اور ذہین، کشادہ ذہن اور بلند افکار لکھنے والوں کو جمع کیا، مضامین میں بھی ایسا تنوّع پیدا کیا کہ اس میں ہر مذاق کا سامان موجود رہے۔ اپنے سلیقے میں، معیار میں، اسلوب و انداز میں "سیاست" ہمیشہ ممتاز و سربلند رہا اس میں ایک طرف عالمی سیاست پر تبصرے ہیں، تو دوسری جانب ملکی مسائل کا عارفانہ جائزہ ہے، تیسری جانب اپنے علاقے اور شہر کی مناسب نمائندگی ہے، تو چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گھریلو اخبار معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایسی معمولی شخصی اور ذاتی خبریں بھی دی جاتی ہیں جن سے ہمیں ایک دوسرے کا احوال معلوم ہوتا ہے۔ سیاست کو مقبول عام بنانے میں اس پالیسی کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

عابد علی خاں ترقی پسند فکر کے آدمی تھے، وہ مخدوم محی الدین کے گہرے دوست اور ساتھی تھے، ترقی پسند تحریک کے حامی اور سرپرست بھی تھے اور اس کے نمایاں حضرات سے ان کی شخصی دوستی اور تعلقات تھے مگر ان کی ترقی پسندانہ فکر میں بھی توازن تھا، وہ مذہب دشمن نہیں تھے، مذہب کی صالح اقدار پر ایمان رکھتے تھے، اولیاء اللہ سے انھیں عقیدت تھی اچھی مذہبی اور تہذیبی رسموں کی افادیت کے قدردان تھے۔ البتہ مذہبی جنون، تعصّب، توہّم پرستی اور بے فائدہ رسوم و رواج کے مخالف تھے اور اس کے خلاف ہمیشہ خاموش جنگ کرتے رہے۔

ایک اہل قلم ہونے کی وجہ سے وہ لکھنے والوں کے قدردان تھے ان کا پورا اکرام کرتے تھے۔ اور اہل سیاست سے زیادہ اپنے تعلقات اہل قلم سے استوار رکھتے تھے۔

وہ ایک عملی انسان تھے انھوں نے اپنی زندگی کو اکارت نہیں کیا اس کے ایک ایک لمحے کو کارآمد بنایا۔ دل کے مریض ہونے کے باوجود ادبی جلسوں میں شرکت کے لیے انگلستان اور عرب ممالک تک سفر کر لیے، درجنوں اداروں سے ان کی وابستگی تھی اور

ان کی ترقی کے لیے اپنی اعانت سے وہ کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ حیدرآباد کو کیا پوری اردو دنیا کو اُن جیسا مخلص و فعّال شخص اب نہ مل سکے گا۔ کاش ہم میں کوئی اور عابد علی خاں پیدا ہو جائے۔ کہ اس وقت ہمیں ایسے مردِ باکار کی سخت ضرورت ہے۔

لوگ عابد علی خاں کو ادیب یا صحافی کہیں، سماجی خدمت گزار، یا اردو کا متوالا جانیں یا کسی دوسرے لقب سے پکاریں، ان کا وصیت نامہ پڑھنے کے بعد تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک "مرد درویش" تھا جس نے اپنی صفاتِ درویشی پر مختلف پردے ڈال رکھے تھے، اس وصیت نامے نے وہ سب پردے اٹھا دیے۔ وہ اپنی زندگی سے یہ ثابت کر گئے کہ:

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

یوسف ناظم
۱۹۔ الہلال ۱۳۰، باندرہ ریکلیمیشن
بمبئی ۵۰

حیدرآباد کی تہذیبی و ادبی سرگرمیوں پر اوس پڑ گئی

کل کوئی ۳ بجے کے قریب دفتر انقلاب سے آنے والے ایک فون نے مجھے دہلا دیا۔ کہا یہی کہ خبر بری ہے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی بری ہوگی۔ چند ہی دن پہلے عابد علی خاں صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ ہر دو چار مہینے میں ایک آدھ مرتبہ فون کر لیتے تھے کچھ پوچھا ہوتا تو کہتے ہیں آدھ گھنٹے بعد پھر فون کروں گا۔ یا تو مجھ کو زیر بار نہیں کرنا چاہتے تھے یا مجھ پر بھروسا نہیں تھا۔

عابد علی خاں جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ میں ان کا ہم جماعت لیکن میرا مضمون الگ تھا۔ ۱۹۴۲ء ہی میں ہم نے گریجویشن کیا۔ وہ نہایت ہنس مکھ، قبول صورت، ملنسار نوجوان تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے۔ قاضی عبدالغفار اڈیٹر پیام ہی کی صحبت نے شاید انھیں صحافت کی دنیا میں، معرکہ آرائی پر اکسایا ورنہ ان دنوں حیدرآباد میں نواب خاندان کے کسی فرد کا صحافت سے رشتہ جوڑنا ایک انوکھی بات تھی۔ عابد علی خاں کی ترقی پسندی نے انھیں اپنے اہل خاندان کی مخالفت کے باوجود اپنی ساری پونجی داؤ پر لگانے کی ہمت دلائی۔ "سیاست" نے ہماری آنکھوں کے سامنے جنم لیا۔ عابد علی خاں شب و روز محبوب حسین جگر کے ساتھ دفتر سیاست کی عمارت کی تعمیر کی نگرانی کرتے اور اخبار بھی چھاپتے وہ زمانہ بڑی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ حیدرآباد نے ۱۹۴۸ء میں، پولیس ایکشن، اور پولیس ایکشن کے بعد فرقہ وارانہ تناؤ کے زخم کھائے تھے۔ اس افراتفری کے زمانے میں ایک نوجوان شخص کا ایک اجنبی دنیا میں قدم رکھنا معمولی بات نہیں تھی۔ عابد علی خاں نے جب روزنامہ سیاست کی بنیاد ڈالی اور ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو اپنا پہلا اخبار اہل حیدرآباد کے ہاتھوں میں پہنچایا تو یہ اخبار ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عابد علی خاں نے اہل خاندان کی مخالفت کو بڑی خندہ روئی کے ساتھ قبول کیا اور چند ہی سالوں میں ان کے اہل خاندان کو اعتراف کرنا پڑا کہ عابد علی خاں نے اپنے مستقبل کے لیے جو فیصلہ کیا وہ بہت دانشمندانہ (بلکہ الہامی) تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں سیاست کے قدم جم گئے اور دفتر روزنامہ سیاست حیدرآباد کا صحافتی، علمی، اور ادبی مرکز بن گیا۔ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد اور اشفاق حسین سے لے کر شاذ تمکنت اور وحید اختر تک اسی شمع کے پروانے بن گئے۔ میں آج سوچتا ہوں تو ایسا

معلوم ہوتا ہے ایک طلسم تھا۔ آج کا تناور درخت جس کا نام روزنامہ سیاست ہے، ۱۹۴۹ء میں ایک ننھا پودا تھا۔ لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پروان چڑھتے دیکھا اور آج یقین مانیے اس درخت کو نظر لگتی ہے۔ یہ ایک فردِ واحد کی دیوانگی، جنوں، محنت اور مشقّت کی یادگار ہے اور زاہد علی خاں یقیناً اسے اپنے غم و اندوہ کے باوجود زندہ و سلامت رکھیں گے۔

عابد علی خاں پچھلے کئی سال سے ہمیں چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے حال حال تک وہ لمبے لمبے سفر کرتے رہے آخری مرتبہ جب لندن گئے تو مزید ایک ہارٹ اٹیک سے دوچار ہوئے۔ کچھ ہی دن پہلے انھوں نے "آرام" کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دفتر آنا جانا ترک کر دیا لیکن وہ ایسا اور اتنا آرام کریں گے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

انھوں نے اچھی زندگی گزاری۔ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ دنیاوی اعزازات بن بلائے ان کے گھر آئے۔ بے حد سعادت مند اولاد پائی۔ میں دور ہونے کے باوجود بھی ان کے قریب رہا۔ ان کی پوتی کی شادی پچھلے سال ہوئی اور انھوں نے مجھ سے بہت پہلے وعدہ لیا تھا کہ میں اس تقریب میں شریک رہوں گا۔ ان کے داماد حامد میرے ایک عزیز دوست کے صاحبزادے ہیں۔ وہ سات بھائیوں میں سے ایک تھے اور حسنِ اتفاق سے ان میں سے چار بھائیوں سے میری شناسائی ہی نہیں، اچھی خاصی دوستی رہی۔

عابد علی خاں بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان کے ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کی سلور جوبلی ہو چکی ہے اور ہندستان و پاکستان کے تمام شاعران مشاعروں میں بہ رضا و رغبت شریک ہوئے ہیں ان مشاعروں کی آمدنی سے انھوں نے کالجوں کی مدد کی ہے اور ایک اردو گھر قائم کیا۔ ان کے عزیز و اقارب اور دوست احباب دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ان کے انتقال سے حیدر آباد سونا ہو گیا وہاں کی تہذیبی، اور ادبی سرگرمیوں پر اوس پڑ جائے گی۔ وہ اردو صحافت کے اہم ستون تھے۔ اردو صحافت انھیں ورثے میں نہیں ملی تھی۔ یہ ان کی ذاتی اور شخصی جائداد تھی۔ قدرت کا یہ عجیب و غریب قانون رہا ہے کہ، ہم عصر، کبھی اپنے ہم عصر کی قدر و قیمت کا وقت پر اندازہ نہیں کرتے، کفِ افسوس، ملنے اور اظہارِ تعزیت کرنے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

عابد علی خاں نیک آدمی تھے۔ انھیں دعاؤں کی شاید ضرورت نہ ہو لیکن مغفرت کی دعا تو ضروری ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب

عابد علی خاں صاحب، چند یادیں

۱۹۶۱ء میں عابد علی خاں صاحب کی کوششوں سے ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ مشاعرہ گاندھی بھون میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں فراق گورکھپوری، روش صدیقی، عرش ملسیانی، فنا کانپوری، جگن ناتھ آزاد، شاہ جہاں بیگم باد، قتیل شفائی کے علاوہ شعرائے حیدرآباد میں، شاہد صدیقی، سلیمان اریب بھی شریک مشاعرہ تھے۔ عائشہ رشاد اس مشاعرے کی ناظم تھیں۔ اس محفل میں عابد علی خاں صاحب شریک تو نہ تھے۔ لیکن کئی دفعہ آئے اور گئے۔ روش صدیقی سے میرے مراسم نیاز علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی سے تھے ایک وقفے میں میں گاندھی بھون کے ایک گوشے میں ان سے مصروف گفتگو تھا کہ عابد علی خاں صاحب روش سے کچھ کہنے کے لیے تشریف لائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے روش نے کہا کہ شکیب سے ملیے۔ آج میرا باقی سارا وقت انہی کے ساتھ گزرنے والا ہے۔ عابد علی خاں صاحب نے کہا کہ شکیب صاحب کو تو میں جانتا ہوں لیکن رات کے کھانے پر آپ کو بروقت پہنچ جانا چاہیے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ شکیب صاحب آج رات کا کھانا آپ بھی ہمارے ساتھ کھایے اور روش صاحب کو شام کے ٹھیک سات بجے لے کر پہنچ جایئے۔ پھر جس تیزی سے اس طرف آئے تھے اسی عجلت سے دوسری طرف چلے گئے۔

رات کے کھانے پر ان شعرا کے علاوہ کچھ اور بھی معززین شہر اور معلم استاذ نگار سلطانہ بھی تھیں۔ مشاعرے کی محفل اور اس دعوت پر مختلف لطیفے، چٹکلے سننے میں آئے لیکن ان سب کا ذکر ہماری گفتگو سے خارج ہے۔ مہمانوں میں سبھی اعلا درجے کے حیدرآبادی پکوان کا لطف لے رہے تھے۔ صرف فنا نظامی کچھ بے چین سے تھے۔ عابد علی خاں صاحب اگرچہ اس دستر خوان پر نہیں تھے جس پر فنا تھے لیکن انھوں نے ان کی بے چینی کو محسوس کر لیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر وہاں آئے اور پوچھا "آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں اور بے چین دکھائی دے رہے ہیں"۔ فنا صاحب نے کہا "کھانا تو بہت اچھا ہے لیکن مرچیں بہت ہیں اور میں مرچیں کھا ہی نہیں سکتا"۔ سادہ سے سادہ دال بھی اُن کے آگے بڑھائی گئی تو اس میں انھیں بہت مرچیں محسوس ہوئیں۔ تب عابد علی خاں صاحب نے میٹھوں کی ڈشیں ان کے آگے بڑھادیں کہ انھیں کھایے۔

واقعی فنا اس پر بہت خوش ہوئے اور نہایت لطف سے انھوں نے روٹیاں میٹھوں سے کھائیں۔ اس پر آپس میں کچھ پُر لطف فقرے چلے جواب مجھے یاد نہیں۔

کھانے کے بعد شعراء اور دوسرے مہمان ایک دوسرے سے ملے۔ عابد علی خاں صاحب نے فراق سے نگار سلطانہ کا تعارف کروایا اور نہایت اچھے الفاظ میں۔ لیکن جب نگار سلطانہ نے بعض حیدرآبادی لڑکیوں کی طرح مردانہ زبان بولنا شروع کی (جیسے میں آیا تھا اور میں گیا تھا) تو فراق نے حیران ہوکر اور اپنے دیدے گھماتے ہوئے نگار سلطانہ کو گھور کر دیکھا اور کہا "یہ تم لڑکوں کی طرح کیسے بولتی ہو"۔ اس سے پہلے کہ نگار سلطانہ کچھ کہتیں عابد علی خاں صاحب نے برجستہ کہا "فراق صاحب یہ حیدرآباد (حیدرآباد پر زور دیتے ہوئے) کی لڑکیاں ہیں الہ آباد کے لڑکے نہیں"۔ اس پر پوری محفل میں ایک قہقہہ پڑا اور اس موضوع پر بہت مذاق ہوا۔

عابد علی خاں صاحب عام طور پر محفلوں میں کم سخن تھے لیکن حسب موقع ایک آدھ معنی خیز فقرہ اس طرح چھوڑ دیتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ ان کی گفتگو اور فقرے نہایت سادہ اور عام فہم ہوتے لیکن سننے والا ان کے معانی پر دیر تک سوچتے رہنے پر مجبور ہوتا۔ ان میں طنز کا عنصر ہوتا لیکن مجروح کرنے والا نہیں ہنسنے اور ہنستے ہنستے غور پر مائل کرنے والا عنصر ہوتا۔

۱۹۶۸ء کے اواخر میں غالب صدی تقریبات منانے کے لیے ایک ریاستی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے صدر دلدار حسین صاحب انجینیر تھے۔ اراکین میں جناب بیرسٹر اکبر علی خاں، جناب عابد علی خاں، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور میں شامل تھا۔ اس کمیٹی کے اصل کرتا دھرتا عابد علی خاں صاحب تھے۔ سارے اہم فیصلے، فیصلوں کی عمل آوری، مالیہ کی فراہمی سب کچھ انہی پر منحصر تھا۔ ویسے بظاہر کمیٹی کے اراکین کے تفویض کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں تھیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو اس یادگار موقع پر دانشوروں سے مقالے لکھوا کر ایک کتاب مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مجھے تنظیم مشاعرہ کی ذمہ داری دی گئی۔ وقت کم تھا وسائل محدود۔ مشاعرے کے اہتمام میں شعراء کو دعوت کے خطوط لکھنے سے لے کر ختم مشاعرہ تک عابد علی خاں صاحب سے گفت وشنید اور اپنی رائے کے اظہار کے سوا شاید ہی میں نے کوئی کام کیا ہو۔ ہر کام میرے نام پر ہوا۔ سیاست میں اس کے اشتہارات اور خبریں میری جانب سے شائع کی گئیں۔ میری اور سب کی خواہش تھی کہ اس موقع پر فیض احمد فیض کو حیدرآباد بلایا جائے۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ لیکن عابد علی خاں صاحب کی کوششوں اور اثرات سے اس راستے کی ساری مشکلیں دور ہوگئیں، اور فیض صاحب پہلی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے سروجنی دیوی ہال، رام کوٹ میں شاندار مشاعرہ ہوا۔ اس یادگار مشاعرے میں فیض اور

اور مخدوم کو لوگوں نے ایک ساتھ دیکھا اور سُنا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اس یادگار مشاعرے کی نظامت نہایت دلچسپ انداز میں کی تھی۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا تقرر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے صدر کی حیثیت سے ہوگیا۔ لہٰذا انھوں نے اس موقع پر مرتب کی جانے والی کتاب کی ذمہ داری سے دست برداری اختیار کر لی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سے کہا گیا کہ وہ علی گڑھ میں رہ کر اس کام کو سرانجام دیں لیکن انھوں نے معذرت کر لی، وسط فروری میں غالب صدی تقاریب کا پروگرام بن رہا تھا اور یہ صورت حال جنوری ۶۸ء کے آخری ہفتے میں پیش آئی۔ غالب صدی تقاریب کمیٹی کی میٹنگ حسب معمول اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر شائع کی جانے والی کتاب کا مسئلہ اب زیادہ اہم بن گیا تھا کیوں کہ وقت نہایت کم تھا۔ مخدوم محی الدین صاحب نے اس کی ترتیب و تدوین کے لیے میرا نام پیش کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس تنگ وقت میں مضامین لکھوانا، کتابت کروانا اور چھپوانا کس طرح ممکن ہے؟ بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب نے سوال کیا کہ شکیب! کیا غالب اور حیدرآباد میں بھی کوئی تعلق تھا؟ میں نے عرض کیا کہ تھا اور اراکین کمیٹی کی خواہش پر چند واقعات غالب اور حیدرآباد کے تعلق سے بیان کیے۔ عابد علی خاں صاحب نے کہا "بس ٹھیک ہے۔ آپ آج سے رخصت لیں اور شب و روز اس کتاب کو لکھنا شروع کر دیں۔ ہم فی صفحے کے حساب سے اس کا معاوضہ بھی دیں گے اور جیسے جیسے یہ کتاب لکھی جائے گی ساتھ ہی ساتھ کتابت اور طباعت بھی ہوتی جائے گی۔ چنانچہ تین ہفتوں کے عرصے میں مجھ سے جو بن پڑا وہ میں نے کیا۔ "غالب اور حیدرآباد" ایک کتاب مرتب ہوگئی۔ عابد علی خاں صاحب سے مسلسل فون پر ربط رہتا اور صبح و شام وہ اس بارے میں باخبر رہتے کہ کام کس مرحلے میں ہے۔ کام کے دباؤ کی وجہ سے ایک آدھ دفعہ میں اُن سے الجھ گیا۔ لیکن اُن کی طبیعت میں بڑا تحمل تھا۔ انھوں نے جس حلم و بردباری سے کام لیا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ کام کرنے اور کام لینے کا انھیں جو سلیقہ تھا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ بڑے سے بڑے کام کو اس سادگی اور سکون سے کرتے اور کرواتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔

رویندرا بھارتی تھیٹر میں اس کتاب کی رونمائی کا اہتمام گورنر آندھرا پردیش کے ہاتھوں ہوا، اور مالک رام صاحب دہلی سے بلائے گئے۔ عابد علی خاں صاحب نے میری تعارفی تقریر میں میری بڑی عزت افزائی کی۔ انہی کے قائم کردہ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد سے شائع کردہ یہ پہلی کتاب تھی جو اس قدر جلد بک گئی کہ چھ مہینے بعد اس کا ملنا مشکل ہوگیا۔

اسی زمانے میں انھوں نے نظام کلب حیدرآباد میں ایک پنج ترتیب دیا جس میں آنند نرائن مُلّا، مالک رام، مخدوم محی الدین، سری نواس لاہوٹی، ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر

زینت ساجدہ کے علاوہ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس لنچ پر ہندستان اور ہندستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں بات نکلی اور چل رہی تھی بعض کا نقطۂ نظر مایوسانہ تھا۔ حسینی شاہد صاحب کا مجاہدانہ لیکن بحث کے دوران عابد علی خاں صاحب نہایت سنجیدگی کے ساتھ صرف ان باتوں کی یاددہانی کرتے جاتے تھے جو اردو والوں کو کرنا چاہیے۔ مثلاً ابتدائی تعلیم پر زور، اردو کتابوں کی اشاعت کے انتظامات جو اس وقت تک بہت مشکل تھے۔ کتابوں کی نکاسی اور اردو کتابوں کی دکانوں کا قیام اور آسان اردو کو فروغ دینے کی کوشش وغیرہ۔ وہ ہمیشہ مسائل کا حل عملی طور پر تلاش کرتے تھے اور غیر عملی نظریاتی گفتگو پر مسکراتے رہتے اور ایک آدھ فقرہ چست کر دیتے۔ کسی بھی مسئلے کی عملی صورت حال پر ان کی نظر جس قدر گہری اور حقیقت پسندانہ ہوتی شاید ہی معاصرین میں کسی اور کی ہو۔ آج اسی بصیرت اور رہنمائی سے اردو محروم ہوگئی۔

۱۹۹۱ء میں عباس زیدی نے اردو مجلس لندن کی جانب سے شہر حیدرآباد کا چار سو سالہ جشن منانے کا اہتمام کیا۔ عابد علی خاں صاحب لندن تشریف لائے اور انھوں نے اس تقریب کی صدارت کی۔ حیدرآباد سے ڈاکٹر سیدہ جعفر بھی آئی تھیں۔ کالونے ہال میں سیکڑوں حیدرآبادیوں کا مجمع اکٹھا تھا۔ خوب خوب تقریریں ہوئیں۔ شہر حیدرآباد کی تاریخ میری تقریر کا موضوع تھا۔ میں نے اپنی تحقیق کی بناء پر کہا کہ یاقوت پورہ جس کا قدیم نام چیلم تھا وہ شہر کا جزو نہیں تھا بلکہ نواح شہر کا ایک موضع تھا۔ یہ موضع چونکہ بھاگ متی کا وطن تھا، سلطان محمد قلی نے ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوتے ہی اس موضع کا نام بھاگ نگر رکھ دیا۔ اس کے کوئی دس سال بعد حیدر کرار کے نام پر اسی موضع سے قریب چار مینار تعمیر کر کے شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح دوسری تفصیلات بیان کیں۔ عابد علی خاں صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کے شروع ہی میں کہہ دیا کہ شکیب صاحب اسکالر ہیں آپ ان کی تحقیق و حقیق کے چکر میں نہ جائیں۔ تحقیق کرنے والوں کی رائیں بدلتی رہتی ہیں۔ ہم شکیب صاحب کی باتوں کو نہیں مانتے۔ ہم تو ان روایات کو مانتے ہیں جو عوام میں صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جہاں اب چار مینار ہے وہی بھاگ نگر تھا اور اسی جگہ بھاگ متی کا گھر تھا۔ یہ شہر محمد قلی اور بھاگ متی کی محبت کی یادگار ہے۔ ابتدائی فقروں پر اور اسی طرح دوران تقریر مختلف مرحلوں پر عابد علی خاں صاحب نے حاضرین کو خوب خوب ہنسایا۔ اور بیچ بیچ میں ایسے نکتے کی باتیں کہہ گئے کہ سننے والوں کو سوچنا بھی پڑا۔ یہ ایک نہایت کامیاب اور یادگار تقریر تھی جس کی ویڈیو تصویریں اب بھی گاہے گاہے انگلستان میں مقیم حیدرآبادی اپنے گھروں میں بیٹھے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ سب کی یہ تمنا تھی کہ کاش عابد علی خاں صاحب پھر لندن آئیں اور بار بار آئیں۔

لندن میں عابد علی خاں صاحب کا قیام بیرسٹر غلام یزدانی کے یہاں تھا۔ سب لوگ ملنے کے لیے وہیں پہنچتے اور صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ہم لوگوں کو اس سے بڑی تشویش تھی کہ صحت پر بار نہ پڑ جائے۔ لیکن عابد علی خاں صاحب کہتے کہ "نہیں میں اچھا ہوں کوئی بار نہیں پڑ رہا ہے۔ بلکہ میں تو یہاں چھٹی گزار رہا ہوں"۔ آنے والے طرح طرح کے لوگ سیاسی و تہذیبی مسائل پر ہر طرح کے سوالات کرتے اور یہ نہایت سکون اور اختصار سے جوابات دیتے جاتے۔ ایک صاحب نے کہا کہ "ہندستانی مسلمانوں کو مین اسٹریم (MAIN STREAM) میں شریک ہونا چاہیے"، عابد علی خاں صاحب نے برجستہ کہا "جناب اب ہندستان میں مین اسٹریم ہے نہ سب اسٹریم ہے۔ ساری اسٹریمس خشک ہو چکی ہیں۔ کسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اگر کسی کا کوئی واضح پروگرام یعنی ایسا پروگرام جو عقل میں آنے والا ہو تو بتائیں۔ جذباتی لہروں سے اسٹریم نہیں بنتا"۔ وہ حق بات کہنے میں کسی کے سامنے نہیں جھجکتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ سچی بات اپنی دلیل آپ ہوتی ہے اور اسے موقع کی مناسبت سے کہہ دینا چاہیے۔ چاہے وہ کڑوی کیوں نہ لگے۔ مین اسٹریم کے تعلق سے ہندستان میں ہونے والے کئی واقعات اور تجربات بیان کیے۔

چوں کہ وہ صحافی تھے لہذا یزدانی صاحب نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ انگلستان سے شائع ہونے والے زیادہ سے زیادہ اخبارات اور رسائل ہر صبح ان کے مطالعے کے لیے فراہم کر دیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ سوائے روزنامہ "جنگ" کے سارے اخبارات و رسائل انگریزی میں تھے عابد علی خاں صاحب ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑتے۔ نہایت توجہ سے سارے اخبارات پڑھنے کی کوشش کرتے۔ انگلستان کا اخبار خواہ وہ ٹائمز ہو یا گارڈین یا انڈیپنڈنٹ سبھی کم از کم چالیس پینتالیس صفحوں کے ہوتے ہیں۔ نہایت اچھے کاغذ پر نہایت صحت و صفائی اور خوب صورتی کے ساتھ چھپتے ہیں۔ اور رسالوں کا تو کہنا ہی کیا۔ دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں انگلستانی صحافت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ ایک صبح جب میں ملاقات کے لیے پہنچا تو دیکھا عابد علی خاں صاحب انگلستان کے انگریزی اخباروں کے ڈھیر کے درمیان صوفے پر تشریف فرما ہیں اور مصروف مطالعہ ہیں۔ اس موقع پر میں نے پوچھا کہ انگلستانی صحافت آپ کو کیسی لگی۔ حسب دستور نہایت سادگی اور اعتماد کے ساتھ ایک فقرے میں جواب دیا۔ JOURNALISTIC WASTE یعنی صحافتی تضیع۔ پھر کہا کہ "بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ ہر خبر بظاہر بڑی مفصل ہے لیکن بے حد تکرار کے ساتھ واقعات بیان ہوئے ہیں اصل میں واقعے یا خبر کی جان کو لے کر مختصراً بیان کر دینا چاہیے۔ ورنہ اس سے نہ صرف صحافتی کاغذ برباد ہوتا ہے بلکہ پڑھنے والے کے وقت اور جیب پر ناجائز بار پڑتا ہے آپ کو اس اخبار کے چولسٹھ صفحوں کو پڑھ کر جلتی معلومات ہوں گی ہمارے سیاست کے

آٹھ تا سولہ صفحوں میں اتنی ساری معلومات مل جائیں گی۔ یہ سب صحافتی ویسٹ (WASTE) ہے،، بات بڑی حد تک سچی تھی۔ دل کو لگی۔ یہ واقعہ ہے کہ یورپ کی صحافت بات کو پھیلا کر بیان کرنے کے ناگوار مرض میں مبتلا ہے۔ ایجاز واختصار اب وہاں کی صحافتی روش میں باقی نہیں رہا۔ اخبار پڑھنا ہو تو ڈھیر دں کا غذ کے پلندے کو لادے پھرنا پڑتا ہے۔

کتنی ہی باتیں ہیں جو یاد آتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن ایک ہی نشست میں سب کچھ لکھنا نہ تو ممکن ہے نہ ہی مناسب۔ یہ چند واقعات خراجِ عقیدت کے طور پر لکھ ڈالے ہیں۔

پیوستہ سال یعنی اگست ۱۹۹۱ ء میں جب حیدر آباد آیا تو مزاج پرسی کے لیے عابد علی خاں صاحب کے مکان پر حاضری دی اس کے بعد دفتر سیاست پر ملاقات ہوئی۔ حیدر آباد پر جو نئی کتابیں چھپ کر آئی تھیں ان کا ایک سیٹ اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کیا۔ ابو الکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ میں ،،سیاست،، لکچرز کے سلسلے میں حیدر آبادی تہذیب پر مجھ سے تقریر کی فرمائش کی۔ میں نے وہ تقریر کی عابد علی خاں صاحب بوجہ ناسازیٔ صحت اس تقریب میں تشریف نہ لا سکے۔ البتہ جگر صاحب تشریف لائے تھے۔ دوسرے دن میں جب ملنے گیا تو موصوف کو پروگرام کی پوری اطلاع مل چکی تھی۔ بہت خوش تھے۔ تقریر کے لیے میرے ہاتھوں میں بہت سے نوٹ تھما دیے۔ میں نے لینے سے انکار کیا تو کہنے لگے کہ میری خوشی ہے۔ بہت محبت اور گرم جوشی سے ملے اور خدا حافظ کہا۔ یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی۔ تاہم آخر وقت تک مراسلت کا سلسلہ رہا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محبوب حسین جگر
جائنٹ اڈیٹر روزنامہ "سیاست"
جواہرلال نہرو روڈ، حیدرآباد

عابد علی خاں

نصف صدی کی مسلسل خدمات

جناب عابد علی خاں نے تقریباً نصف صدی تک حیدرآباد میں اُردو زبان و ادب اور ترقی پسند افکار کی بڑی خاموش خدمت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے گریجویشن سے قبل، عابد علی خاں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا۔ وہ فلسفہ کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر شیوموہن لال کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا پہلا مضمون سگمنڈ فرائیڈ ۱۹۴۰ء میں نگار، لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ اخبارات "پیام" اور "رعیت" میں اہم سیاسی مضامین پر ان کے ترجمے شائع ہوا کرتے تھے۔ گریجویشن کے بعد کافی ہاؤس میں شام میں تمام ادیب و شاعر جمع ہوا کرتے تھے۔ یہیں مخدوم محی الدین سے ملاقات ہوئی۔ غالباً ۱۹۴۳ء میں جب کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی برخاست ہوئی اور پارٹی کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ مخدوم صاحب کے اصرار پر عابد علی خاں نے کمیونسٹ پارٹی کانگریس میں شرکت کی۔ وہ جناب سجاد ظہیر کے گھر پر ٹھہرائے گئے جہاں نورالحسن صاحب (گورنر مغربی بنگال) بھی انہی دنوں لندن سے حصول تعلیم کے بعد واپس لوٹے تھے اور یہیں مقیم تھے۔ سجاد ظہیر صاحب نے عابد علی خاں صاحب کو کارل مارکس کی کتاب (WAGE LABOUR AND CAPITAL) ترجمہ کے لیے دی جو ماڈرن بک ڈپو حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ادارہ ادبیات اُردو کے زیر اہتمام ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جس میں غیر منقسم ہندستان کے کئی شہروں بشمول ڈھاکہ اور لاہور کے کئی ادیب و شاعر و مشاہیر شریک تھے۔ مجھے سر محمد یعقوب، حضرت خواجہ حسن نظامی، حفیظ جالندھری اور جگر مرادآبادی کے نام یاد ہیں۔ زور صاحب نے عابد علی خاں صاحب کو اس کانفرنس میں ترقی پسند ادب کے شعبہ کا کنوینر مقرر کیا۔ اس اجلاس کے لیے سجاد ظہیر صاحب مدعو کیے گئے۔ سجاد ظہیر صاحب کا یہ پہلا دورہ حیدرآباد تھا۔ محترمہ سروجنی نائیڈو نے سجاد ظہیر صاحب کی ایک علاحدہ تقریر کے انتظام کے لیے عابد علی خاں صاحب سے خواہش کی۔ چنانچہ ریڈی ہاسٹل عابد روڈ میں سجاد ظہیر صاحب کی تقریر کا انتظام کیا گیا جس میں سروجنی نائیڈو ان کی دونوں صاحبزادیاں، مسز پدمجا نائیڈو

اور لیلا منی نائیڈو کے علاوہ عثمانیہ یونی ورسٹی گرلز کالج کی بعض اساتذہ اور طالبات نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا حیدرآباد میں پہلا جلسہ تھا۔

جنگ کے دوران جب ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی، عابد علی خاں صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بنائے گئے۔ انھوں نے عوام کی اس غلط فہمی کو کہ یہ تحریک کمیونسٹوں سے تعلق رکھتی ہے، دور کیا یادِ حالی کا پروگرام منعقد کیا جس میں ایک طرف مسز سروجنی نائیڈو اور ابوالحسن سید علی صاحب صدر مجلس اتحادالمسلمین شریک تھے تو دوسری طرف قاضی عبدالغفار اور مولوی عبدالحق جو ان دنوں ایک دوسرے کے حریف تھے، عابد علی خاں صاحب کا یہ پہلا اہم کارنامہ تھا کہ انھوں نے مختلف مکاتبِ خیال کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔

عابد علی خاں صاحب کا تعلق حیدرآباد کے ایک ممتاز جاگیردار گھرانے سے تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ان کی شادی میں حضور نظام نے شرکت کی تھی جو ان دنوں ایک غیر معمولی بلکہ اہم واقعہ تھا۔ نظام صرف امرائے عظام کے گھرانوں کی شادیوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انھیں اچھی ملازمت مل سکتی تھی۔ لیکن انھیں ملازمت سے دلچسپی نہیں رہی اور وہ ادبی تحریکات سے وابستہ رہے۔

۱۹۴۹ء میں جبکہ ریاست حیدرآباد کا ہند یونین میں انضمام عمل میں آیا، عابد علی خاں صاحب نے اپنی گزیٹڈ پوسٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ سوچتے رہے کہ اب کیا قدم اُٹھایا جائے۔ ان دنوں تلنگانہ جدوجہد کے باعث کمیونسٹ پارٹی پر پابندی تھی۔ کئی اہم اخبارات رہبرِ دکن، میزان وغیرہ بند تھے۔ پیام اور رعیت جو بائیں بازو کے اخبارات تھے، مشکلات سے دوچار تھے۔ عابد علی خاں صاحب نے ایک اخبار کی ضرورت محسوس کی تاکہ عوام کے نئے مسائل سامنے آئیں۔ نئی سیاسی تبدیلیوں نے جو مسائل پیدا کئے ہیں وہ حل ہوں۔ آصفی حکومت کے خاتمہ سے مسلمانوں اور اُردو کے جو مسائل پیدا ہو گئے ہیں اُن کی ترجمانی اور رہبری ہو چنانچہ ۱۵ راگست ۱۹۴۹ء کو اخبار سیاست کی اجرائی عمل میں آئی۔ ایک اچھا اخبار سامنے آیا مگر اسے جلد اور آسان پذیرائی نہیں ہوئی چونکہ پرانے سماج پر جو کاری ضرب پڑی تھی اس دور میں ایک نئی آواز، نئی فکر اور نئی پہل کو عوام قبول کرنے میں پس و پیش اور تامل کرتے رہے۔ عابد علی خاں صاحب کے افکار اور سیاست میں قاضی عبدالغفار کے پیام کی جھلک نے کانگریس اور کمیونسٹ قائدین دونوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب سیاست کو مسلم عوام اور سیاسی جماعتوں کے قریب کرنے کے لیے اہمیت دی جائی ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں چیف منسٹر مسٹر بی رام کرشنا راؤ نے عابد علی خاں صاحب سے خواہش کی کہ ریاست کے ہند یونین میں انضمام کے بعد مسلمان جس سیاسی علاحدگی اور پس و پیش سے دوچار ہیں انھیں قریب تر کرنا چاہیے۔ انھوں نے ممتاز مسلمانوں کے ایک اجتماع کی خواہش کی۔ عابد علی خاں صاحب نے اپنے گھر پر اس وقت کے تمام ممتاز علما، مشائخین، قائدین اور اعلا عہدہ داروں کا جن کی کچھ آواز تھی اپنے گھر پر جلسہ منعقد کیا جس میں ڈاکٹر سید عبداللطیف، نواب سعید جنگ (چیف جسٹس) نواب مقصود جنگ، نواب محمود یار جنگ، نواب ناظر یار جنگ، بیرسٹر اکبر علی خاں،

پدما بھوشن غلام یزدانی اور پروفیسر حبیب الرحمٰن کے نام یاد آرہے ہیں۔ اس جلسہ میں مسلمانوں کے عملی سیاست میں حصہ لینے کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ کئی قائدین نے مسلمانوں کی گرفتاریوں املاک و جائیدادوں کی تباہی اور ملازمتوں سے علاحدگی، بے روزگاری، جاگیردارانہ نظام کی برخاستگی کے مسائل پر توجہ دلائی۔ چیف منسٹر کے علاوہ مسٹر ڈگمبر راؤ بندو، گوپال راؤ اکبوٹے اور پنڈت نریندر جی نے جو اس جلسہ میں موجود تھے کہا کہ جو کچھ ہوا اب اس کی تلافی کا کام شروع کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد بلدی الکشن میں کانگریس نے ممتاز مسلمانوں کو کانگریس پارٹی کے لیبل کے بغیر انتخابات میں حصہ لینے کی ترغیب دی اور انھیں کامیاب بنایا۔

عابد علی خاں نے سیاست کے آغاز ہی سے اُردو کے مسائل پر توجہ کی۔ حبیب الرحمٰن صاحب کو انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ حوالہ کی گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ سرکاری دفاتر سے اُردو برخاست کردی گئی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اُردو سے انگریزی کر دیا گیا تھا۔ مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام بدل چکا تھا۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے انجمن ترقی اردو کے دفتر کے لیے اپنے بنگلہ میں سے کچھ حصہ اراضی کا عطیہ دیا۔ جناب سجاد مرزا ناظم تعلیمات نے بارہ پندرہ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ یہ طے کیا گیا کہ سرچھپانے کے لیے ہال بنالیا جائے۔ عابد علی خاں صاحب نے اردو ہال کی تجویز پیش کی۔ پروفیسر شروانی اور پدما بھوشن غلام یزدانی نے پوچھا کہ رقم کہاں سے آئے گی۔ جاگیریں برخاست ہوگئیں، نوکریوں سے نکالا جارہا ہے، مسلمانوں کی مالی حالت خراب ہے۔ عابد علی خاں صاحب نے فنڈز کی فراہمی اپنے ذمہ لی۔ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن سے ایک گراں قدر عطیہ حاصل کیا۔ حکومت حیدرآباد سے بھی مدد لی اور اس طرح اُردو ہال کی تعمیر عمل میں آئی جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ انجمن نے اُردو تعلیم اور سرکاری دفاتر میں اردو کے استعمال کے لیے عہد ساز خدمات انجام دیں۔

فضل علی کمیشن کی سفارشات کے بموجب جب سابق ریاست حیدرآباد کے تلنگو، مرہٹی اور کنڑا علاقہ کی آندھرا، بمبئی اور کرناٹک کی ریاستوں میں انضمام کی تجویز پیش ہوئی تو فضل علی کمیشن نے پانچ سال کے لیے علاحدہ تلنگانہ کی سفارش کی تھی۔ روزنامہ سیاست نے سب سے پہلے اس سفارش پر اداریہ کے ذریعہ آندھرا پردیش کی تشکیل کا مطالبہ کیا اس کے ایک ہفتہ بعد چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشن راؤ نے ریاست کی لسانی تقسیم کے لیے ریاستی کابینہ کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ دہلی میں ایک طاقتور گروپ اُردو کے تحفظ کے لیے علاحدہ ریاست تلنگانہ کی تشکیل چاہتا تھا۔ اور اردو کا مسئلہ کسی فیصلے و اعلان میں حائل تھا۔ چیف منسٹر بی رام کرشنا راؤ کی طلبی پر عابد علی خاں صاحب، حبیب الرحمٰن صاحب اور محمد یونس صاحب چیف انجینئر ریٹائرڈ دہلی گئے۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے ملاقاتیں کیں اور پانچ سال تک علاحدہ تلنگانہ کے بجائے نئی ریاست آندھرا پردیش میں اردو کے لیے تحفظات و تیقنات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شاید اسی لیے رام کرشنا راؤ صاحب نے پہلے عام انتخابات میں اسمبلی کے

لیے عابد علی خاں صاحب کو حلقہ آلیر کے لیے ٹکٹ دیا جسے انھوں نے مسترد کر دیا۔

انجمن ترقی اُردو کے استحکام کے ساتھ عابد علی خاں صاحب نے ۱۹۶۶ء میں ادبی ٹرسٹ قائم کیا۔ ان دنوں حیدرآباد میں کوئی علمی کتاب نہیں ملتی تھی۔ حیدرآباد جو اردو کا اہم مرکز رہا ہے، یہاں کے تمام اُردو کتب گھر برخاست ہو گئے تھے۔ کسی ادیب و شاعر کی تصنیف و تالیف کی اشاعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادیبوں کی مدد اور علاج کے لیے سابق میں جو شاہانہ اور حکومت کی سرپرستی حاصل تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ عابد علی خاں صاحب نے نواب مہدی نواز جنگ کی ہدایت اور تعاون سے مقصدی مشاعروں کا آغاز کیا۔ مشاعرہ میں شرکت کے لیے اگر ٹکٹ رکھا گیا تو اس موقعہ پر ایک ساوینئر بھی شائع کیا جانے لگا۔ جس کے اشتہارات سے پچاس ساٹھ ہزار کی سالانہ آمدنی شروع ہوئی۔ گذشتہ ۲۰ سال میں ان مشاعروں سے عابد علی خاں صاحب نے تیس لاکھ روپے سے زائد رقم جمع کی۔ سب سے پہلے حیدرآباد کے اُردو آرٹس کالج کے لیے تین چار لاکھ روپے فراہم کئے۔ خود ادبی ٹرسٹ کے کارپس کو مستحکم کیا جو ادیبوں کی علالت، انتقال کے علاوہ نئی کتابوں کی اشاعت میں مدد دیتا تھا۔ عابد علی خاں صاحب نے شہر کے مشہور شاپنگ سنٹر عابد روڈ پر کنارا بینک کا ایک شوروم حاصل کیا اور وہاں بک اسٹال قائم کیا۔ عابد علی خاں صاحب نے اردو اکیڈمی کے پہلے صدر مجلس عاملہ کی حیثیت سے کتابوں کی اشاعت، سیمینار ادیبوں کی مدد اور انھیں اعزاز دینے کا جو پروگرام شروع کیا تھا۔ وہ اب بھی اُردو اکیڈمی کے لیے لائق تقلید ہے۔ آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد حکومت نے ایک نیا عصری اردو کتب خانہ قائم کیا تھا راے جانکی پرشاد اور جناب علی اکبر صاحب سابق ناظم تعلیمات اس کے ذمہ دار تھے۔ عابد علی خاں صاحب نے اسے اردو اکیڈمی کے لیے حاصل کر لیا اور اسے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے ذریعہ پرانے شہر میں ایک اُردو گھر تعمیر کیا جہاں دارالمطالعہ کے علاوہ اُردو تعلیم بالغان کا مرکز، ایک ماڈل اسکول اور انجینئرنگ و میڈیسن کے طلبہ کے لیے بک بینک قائم کیا گیا۔ ادارہ ادبیات اردو کو ڈاکٹر زور صاحب کے بعد بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ حکومت سے سالانہ صرف چھے ہزار روپے کی امداد ملتی تھی۔ عابد علی خاں صاحب نے مشاعروں اور عطیوں سے ڈھائی لاکھ روپے سے ادارہ ادبیات اُردو کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا جس سے اب سالانہ پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہوتی ہے اور چھے ماہ قبل حکومت ہند نے ادارہ ادبیات اردو کے میوزیم کے لیے پچاس ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے۔

عابد علی خاں صاحب نے حیدرآباد کی سب سے بڑی صنعتی نمائش میں جو جنوری میں منعقد ہوتی ہے اور ۱۵ فروری تک جاری رہتی ہے، دس سال قبل اردو کتابوں کا اسٹال قائم کیا جسے ملک کے تمام ممتاز پبلشروں کا تعاون حاصل ہے۔ اس اسٹال پر ہر سال تقریباً ایک لاکھ روپے سے زائد کی اردو کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ حیدرآباد میں سال میں ایک موقعہ

ایسا آتا ہے جبکہ ہندستان اور پاکستان کی تقریباً تمام اہم اردو مطبوعات ایک اسٹال پر مل جاتی ہیں۔

عابد علی خاں صاحب نے انجمن ترقی اُردو کے پلیٹ فارم سے نظم ونسق میں اُردو کے سرکاری استعمال اور انجمن ترقی اُردو کی مالی امداد کے لیے پچاس ہزار کی سالانہ گرانٹ منظور کرائی جواب تک جاری ہے۔

حیدرآباد میں اقبال صدی تقاریب اور غالب صدی تقاریب کی عابد علی خاں صاحب کو ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ غالب صدی تقاریب اور اقبال صدی تقاریب حیدرآباد میں بہت شاندار پیمانے پر منائی گئیں۔ گجرال کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے عابد علی خاں صاحب نے تین زبانی فارمولے اور صحافت کے لیے اہم تجاویز کو شریک رپورٹ کروایا۔ عابد علی خاں صاحب ایک دہے قبل انجمن ترقی اردو سے علاحدہ ہو گئے تھے۔ انجمن ترقی اُردو کی ۱۹۸۴ء میں سالانہ کانفرنس میں تعلیم کے لیے چار زبانی قرارداد کے فارمولے کی سطور سے انھیں اختلاف تھا مگر انھوں نے انجمن کے باہر رہ کر اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی وہ حیدرآباد کی اُردو تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ادبی ٹرسٹ نے کئی ادیبوں کی مدد کی۔ ان کی تصانیف کی اشاعت میں تعاون کیا۔ خود سیاست کے مضامین پر مشتمل بیس کتابوں کی اشاعت ایک صحافتی کارنامہ ہے۔ اب روزنامہ جنگ پاکستان نے بھی اپنے صفحات پر شائع شدہ مضامین کے مجموعوں کی اشاعت کا آغاز کیا ہے۔

عابد علی خاں صاحب نے اُردو زبان کو صرف اپنی مادری زبان ہی نہیں سمجھا بلکہ وہ اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب اور علامت تصور کرتے ہوئے اردو کا تحفظ اور ارتقا چاہتے تھے۔ ان کے کام کی وجہ سے ان کی آواز معتبر اور قابل لحاظ بن گئی۔ جب ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد کے چار سو سال پورے ہو رہے تھے۔ انھوں نے جدہ، کویت اور لندن میں جشن حیدرآباد میں شرکت کی اور ریاستی حکومت کے بجائے اپنی پہل سے چار مینار پر مہاراجا کشن پرشاد شاد کا تمثیلی مشاعرہ پیش کیا۔ شاید ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہو کہ شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر چار گھنٹوں تک مشاعرہ ہوتا رہا۔ ہزاروں لوگ شریک مشاعرہ تھے۔ چار مینار کے چاروں طرف ٹریفک بند رہی۔ چار مینار کے چار سو سالی کی تاریخ میں یقیناً کبھی کہیں اتنا بڑا مجمع نہیں ہوا ہوگا۔ حکومت آندھرا پردیش نے مارچ ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد کے چار سو سال کے جشن کی تقاریب کا اعلان کیا مگر اسے ملتوی کیا گیا۔ عابد علی خاں صاحب نے اعلان کیا کہ اسی ملتویہ تاریخ کو قلعہ گولکنڈہ میں بانی شہر محمد قلی قطب کے گنبد پر جلسہ ہوگا، مشاعرہ ہوگا، قطب شاہوں کی تاریخ کی جھلک دکھائی جائے گی۔ محمد قلی اور بھاگ متی کو کردار کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ جلسہ میں مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل مسٹر ارجن سنگھ کے علاوہ گورنر، وزرا کے علاوہ ہزاروں عوام اور سیکڑوں بیرونی شہری شریک جلسہ تھے۔ گولکنڈہ میں اس صدی میں یہ سب سے بڑا اجتماع تھا۔ عابد علی خاں صاحب نے کئی تہذیبی محفلیں منعقد کیں ادبی اجلاس، سیمینار اور

سمپوزیم، نمائش میں ان کی خاص دلچسپی تھی اور پھر سیاست توسیعی تقریر کا تجربہ اب بھی سارے ملک میں منفرد ہے۔

عابد علی خاں صاحب کو کئی اعزاز ملے ہیں۔ پدما شری، غالب ایوارڈ اور الامین سوسائٹی بنگلور کے کمیونٹی ایوارڈ کے علاوہ انھیں کئی اعزازات حاصل ہوئے۔ اوپن یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کا اعزاز دیا۔ ان کے نام مشاہیر کے خطوط، ایک بہت بڑا اثاثہ ہیں سیاست پر اور عابد علی خاں صاحب پر طلبہ نے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ سیاست آج ملک کا دوسرا کثیر الاشاعت اخبار ہے اور واحد اخبار ہے جو خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ کے مختلف شہروں میں اس کی ایجنسیاں ہیں۔

عابد علی خاں صاحب کو اگست میں انجینا کا عارضہ لاحق ہوا اگرچہ کہ وہ دل کے پرانے مریض تھے۔ دو مرتبہ دل پر سخت حملوں کا انھوں نے مقابلہ کیا۔ دو ماہ سے گھر پر آرام کی ہدایت کے باوجود وہ آخری دن تک کام کرتے رہے۔ انھوں نے علالت کے باوجود حیدر آباد پر لکھی جاتے والی دو ضخیم انگریزی کتابوں کے مسودوں پر نظر ثانی کی۔ ۱۲ر نومبر کی رات دو بجے سانس لینے میں تکلیف محسوس کی۔ انھوں نے تمام اہل خاندان کو بلایا باتیں کیں اور ۴.۳۰ بجے اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔ ان کے انتقال کی خبر صبح کی ریڈیو اور ٹی وی نشریات سے جونہی عام ہوئی حیدر آباد میں ان کے جاننے والوں میں گہرے رنج والم کا اظہار کیا گیا۔ حیدر آباد کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ میں شاید ایسا ماتم کسی شخص کا ہوا ہو۔ گورنر اور چیف منسٹر سے لے کر تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین، تمام مذاہب کے پیشوا، تمام زبانوں کے صحیفہ نگاروں اور عوام نے شرکت کی۔ انگریزی اور تلگو اخبارات کی جانب سے ان کی میت پر پھول چڑھائے گئے۔ صبح سے شام تک ہزاروں افراد نے عابد علی خاں صاحب کا آخری دیدار کیا۔ ان کی تدفین کے موقعہ پر گورنر شری کرشن کانت آخر تک موجود تھے اور قبر میں مٹی ڈالی۔ ان کے انتقال پر سکھوں اور ہندوؤں نے دعائیہ اجتماعات منعقد کیے۔ ان کے انتقال پر پیامات تعزیت کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کے انتقال کے دوسرے دن ان کا وصیت نامہ کھولا گیا۔ ان کی ہدایت کے باعث دوسرے دن سے ان کے بارے میں سیاست میں کچھ شائع نہیں ہوا۔ ان کا کوئی تعزیتی جلسہ نہیں ہوا۔ ان کی قبر پر کتبہ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ مجھے صرف دعائے مغفرت چاہیے۔

عابد علی خاں صاحب اب ہم میں نہیں ہیں لیکن انھوں نے سیاست کے معیار کے لیے اُردو زبان و تہذیب کے لیے حیدر آباد کے اعلیٰ اقدار کے لیے جو کام چھوڑے ہیں وہ اہل حیدر آباد اور اہل اُردو کی ذمہ داری بن گئے ہیں۔

مجھے عابد علی خاں صاحب کے ساتھ ابتدا سے کام کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ نیک نفس، آہنی عزم اور مسلسل کام ان کا اہم وصف تھا۔ ان کے انتقال پر دکن کرانیکل نے ان پر اپنے مضمون کی سرخی لگائی تھی HYDERABAD WILL MISS HIM ان کے انتقال پر ملک کے مختلف شہروں سے جو خطوط آئے ہیں ان سب کا مشترکہ جملہ یہ ہے کہ "ہم اب حیدر آباد میں کس

سے ملیں"، دکن کرانیکل نے ان کے بارے میں ایک جملہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے کہ (A FRIEND OF ALL ENEMY OF NONE) عابد علی خاں صاحب نے نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی اور اقلیتوں کے مفاد کے لیے جو کام کیا ہے وہ صرف خدا کا فضل تھا اتنے بڑے کام ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہو سکتے۔ عوام کو ان پر اعتماد تھا۔ کسی بھی نیک کام کے لیے ان پر عطیوں کی بوچھار ہوتی تھی۔ کالج کے طلبہ کی امداد، ادیبوں کا علاج، تجہیز و تکفین اور ضرورت مندوں کی مدد۔ غریب لڑکیوں کی شادیاں، ان کاموں کے لیے ان کے پاس پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔ عابد علی خاں صاحب نے جو کام شروع کیے وہ پایہ تکمیل کو بھی پہونچتے رہے۔ انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور زندگی کا آخری سفر بھی عزت و محبت و خلوص اور کلمات خیر سے طے کیا۔ انھوں نے جو کام چھوڑا ہے اس کی تکمیل کے لیے خدا کا فضل اور ان کے مخلصین کی دعائیں درکار ہیں۔

مجتبیٰ حسین
۴۰۰، انکور اپارٹمنٹس، نونرمان ہاوزنگ سوسائٹی
پلاٹ نمبر ۷، پٹ پڑ گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

عابد علی خاں صاحب کی یاد میں

جب کوئی بڑا آدمی دنیا سے گزرتا ہے تو اس کے ساتھ بہت کچھ گزر جاتا ہے۔ عابد علی خاں صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے تو شخصی طور پر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے وجود کا وہ حصہ بھی مرگیا ہے جو اُن کی ذات کا مرہونِ منت تھا اور جس کی تشکیل انھوں نے قدم قدم پر پچھلے چار دہوں میں کی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان کے ساتھ وہ حیدرآباد بھی اٹھ گیا جسے انھوں نے بڑے جتن کے ساتھ اپنے اندر بسایا تھا۔ حیدرآباد کے اندر ان کی حیثیت خود ایک الگ حیدرآباد کی تھی۔ ان کے اندر وہ حیدرآباد آباد تھا جو صرف عمارتوں اور شاہراہوں سے عبارت نہیں تھا بلکہ وہ حیدرآباد آباد تھا جو انسانی تہذیب کی بہترین اقدار، بہترین روایات اور بہترین جذبوں سے مزین تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے خود حیدرآباد کے اندر حیدرآبادی تہذیب کے ایک جزیرہ کے طور پر زندہ رہے۔ سچ پوچھیے تو وہ حیدرآباد جسے کہ جیسا ہونا چاہیے وہ ان کے اندر آباد تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اپنی بات کو کہاں سے شروع کروں۔ چار پانچ دہوں پر پھیلی ہوئی یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے انھیں دیکھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جب چھے سات سال کا تھا تو انھیں سب سے پہلے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے ساتھ کلیانی میں دیکھا تھا جہاں میرے والد تعلقدار تھے۔ وہ اُن کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور وہ دو ایک دن کے لیے کلیانی آگئے تھے۔ روزنامہ "سیاست" کا جب پہلا شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا تھا تو تب میں حیدرآباد میں تھا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں عثمانیہ یونی ورسٹی کا طالب علم تھا تو تب بھی "سیاست" میں چھوٹی موٹی تحریریں لکھا کرتا تھا۔ اپنا نام پکی روشنائی میں چھپا ہوا سب سے پہلے "سیاست" میں ہی دیکھا۔ ۱۹۵۶ء میں تعلیم ختم کرنے کے بعد میں "سیاست" سے باضابطہ طور پر وابستہ ہوگیا۔ مجھے "سیاست" کے وہ ابتدائی دن یاد ہیں جس کا دفتر ٹین کی چھت والے دو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ اسی کے ایک ہال میں ایک پرانی لیتھو مشین تھی جس پر "سیاست" چھپتا تھا۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے وہ عجیب پر آشوب دور تھا، اقدار ٹوٹ رہی تھیں۔ پرانا معاشرہ بکھر رہا

تھا۔ ماضی کو حال سے اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کی کڑیاں نہیں مل رہی تھیں۔ عابد علی خاں نے اسی ایک چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ کر اُن گمشدہ کڑیوں کو جوڑنے، ایک نئی سوچ پیدا کرنے، جینے کے ایک نئے ڈھنگ کو آراستہ کرنے کا آغاز کیا۔ یہیں بیٹھ کر وہ اور جگر صاحب اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا کرتے تھے۔ دفتر میں کام کرنے والے بھی چار پانچ ہی تھے۔ وہ اخبار کے اڈیٹر ہی نہیں تھے سب کچھ تھے۔ اُن دنوں اردو صحافت شدتوں کا شکار تھی۔ شدتوں اور انتہا پسندی کے درمیان عابد علی خاں صاحب نے "سیاست" کے لیے اعتدال پسندی، غیر جانب داری اور ایک ایماندارانہ میانہ روی کی روش اپنائی۔ اُن دنوں کے پس منظر میں یہ سفر کتنا کٹھن تھا اِس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اُس کربناک دور سے گزر چکے ہیں۔

اب اُن کی ۷۲ سالہ زندگی کی طرف دیکھتا ہوں (جس کے کم و بیش پینتالیس برسوں کا میں عینی شاہد ہوں) تو احساس ہوتا ہے کہ عابد علی خاں ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو کسی واقعہ یا کسی مخصوص پس منظر کے سبب اچانک بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ حیدر آباد کے ایک معزز جاگیردار گھرانے میں وہ ضرور پیدا ہوئے تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے خاندانی پس منظر کو اپنی شناخت کا حصّہ بننے نہیں دیا۔ لمحہ لمحہ جوڑ کر انھوں نے اپنی شخصیت کی عمارت کھڑی کی تھی۔ ایک ایک پل کا صحیح، دانشمندانہ اور بھرپور استعمال کرکے، محض اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ بڑے آدمی بنے تھے۔ زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی بات کا وہ تفصیل سے جائزہ لیتے تھے۔ زندگی کے کسی بھی واقعہ کو وقتی جذبات سے اُوپر اُٹھ کر دیکھنے کا انداز اُن کا اپنا تھا۔ انھوں نے زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ جذبات کی رَو میں بہہ کر نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ روزنامہ "سیاست" کی پالیسی اُن کی اپنی شخصی سوچ کی آئینہ دار تھی۔ بہت عرصے پہلے جب "سیاست" ابھی اتنا بڑا اخبار نہیں بنا تھا تب بھی اُن کی شخصیت نہایت باوقار تھی اور بعد میں جب "سیاست" ہندستان کا دوسرا کثیر الاشاعت اخبار بن گیا تو ان کے مزاج کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے مزاج میں سادگی اور تمکنت دونوں کا جو حسین امتزاج تھا وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ عام طور پر تصوّر کیا جاتا ہے کہ آدمی جب اُردو کا کوئی اخبار نکالتا ہے تو اُسے اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ دینا پڑتا ہے۔ عابد علی خاں ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے کٹھن سے کٹھن مرحلہ میں بھی اپنی خودداری اور اَنا کی حفاظت کی۔ ان کی یہی شخصی خودداری بعد میں اردو صحافت کی خودداری کی علامت بن گئی۔

"سیاست" کے اجراء سے بہت پہلے، اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی اُن کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی جو کل ہند کانفرنس ہوئی تھی اس کے وہ معتمد عمومی بھی رہے۔ یہ ایک عہد آفریں کانفرنس تھی جس کی بنیاد پر کرشن چندر نے اپنا شہرۂ آفاق رپورتاژ "پودے" لکھا تھا۔ ان کا یہ ادبی پس منظر "سیاست" کے

لیے بھی ممد و معاون ثابت ہوا اور حیدر آباد کے سارے اہم ادیبوں اور صحافیوں کا تعاون "سیاست" کو ہمیشہ حاصل رہا۔ مخدوم محی الدین جب بھی کوئی نئی نظم یا غزل کہتے تو وہ سب سے پہلے "سیاست" میں ہی شائع ہوتی تھی۔ سکندر علی وجد، اشفاق حسین، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، عزیز قیسی میر حسن، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، رشید قریشی، اختر حسن، شاذ تمکنت، عوض سعید مغنی تبسم، وحید اختر، زینت ساجدہ، اقبال متین، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، اوج یعقوبی، واجدہ تبسم اور بیسیوں حیدرآبادی ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات سب سے پہلے "سیاست" میں چھپنے کے لیے بھیجتے تھے۔ "سیاست" کو اپنے ابتدائی دور میں ہی نہایت سلجھے ہوئے صحافیوں کی خدمات حاصل رہیں۔ جو صحافت کو صرف ذریعۂ معاش نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُسے اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے۔ ہاشم سعید، غلام حیدر، احسن علی مرزا، احمد معظم، اسد جعفری، مصطفےٰ علی اکبر، مہدی عابدی، شریف اسلم، وہاب حیدر سب کسی نہ کسی دور میں "سیاست" سے وابستہ رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے اکثر صحافیوں کی ذہنی تربیت "سیاست" میں ہی ہوئی۔ شاہد صدیقی برسوں "سیاست" کا مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھتے رہے۔

میں کبھی اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میری ساری ادبی اور صحافتی زندگی "سیاست" ہی کی دین ہے۔ ابتدا میں سات آٹھ برس تک میں نے "سیاست" میں صحافی کی حیثیت سے ہی کام کیا مگر جب ۱۹۶۲ء میں شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو "سیاست" کا طنزیہ و مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھنے کی ذمّہ داری مجھے سونپی گئی۔ پتا نہیں عابد علی خاں صاحب نے اس کام کے لیے میرا انتخاب کس بنا پر کیا تھا کیونکہ میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی مزاحیہ تحریر نہیں لکھی تھی۔ مگر اب احساس ہوتا ہے ان کا انتخاب بہت سوچا سمجھا تھا۔ یقین مانئے اگر وہ مجھے مزاحیہ کالم لکھنے کا کام نہ سونپتے تو مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ مجھ میں مزاح لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بعد میں ادبی حلقوں میں میری شناخت ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہونے لگی اور اب تو اپنی یہی ایک پہچان رہ گئی ہے۔

مجھے "سیاست" کے ابتدائی چھ سات برس اب تک یاد ہیں۔ جب اخبار کے قدم پوری طرح جم نہیں پائے تھے۔ عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب اخبار کے کام میں لگاتار اور مسلسل مصروف رہتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی ان دونوں کی مصروفیت رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ دفتر کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں شام کے وقت عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب چائے پینے کے لیے اکٹھا ہوتے تھے۔ میں بھی چائے میں شریک رہتا تھا۔ اخبار کے مسائل پر چائے کے دوران ہی دس پندرہ منٹ گفت گو ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ابتدائی چھ سات برسوں میں کئی مرحلے ایسے آئے جب لگتا تھا کہ اخبار بند ہو جائے گا۔ اخبار کو چلانے کے لیے عابد علی خاں صاحب نے اپنی جائیداد کا بڑا حصّہ فروخت کر دیا تھا۔ سخت آزمائش کے دن تھے۔ حیدر آباد کی اردو صحافت میں

ان دنوں سنسنی خیزی کا دور دورہ تھا اور "سیاست" نے سنسنی پھیلانے والی خبروں کی اشاعت سے ہمیشہ گریز کیا۔ ۱۹۵۶ء میں نہر سوویز پر برطانیہ کا حملہ روزنامہ "سیاست" کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ "سیاست" نے تازہ ترین خبروں کی اشاعت اور متن کو موثر انداز میں پیش کر کے اپنی اہمیت منوالی۔ اس کے بعد "سیاست" نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان دنوں عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب سائیکل پر دفتر آیا کرتے تھے بعد میں جب حالات ذرا بہتر ہوئے تو سائیکل رکشا میں گھومنے لگے۔ پھر آٹو رکشا میں نکلنے لگے۔ "سیاست" کی اشاعت کے آٹھ نو برس بعد ہی انھوں نے موٹر خریدی۔ جب اخبار کے قدم جم گئے تو نہایت منصوبہ بند طریقہ سے انھوں نے "سیاست" کو ایک مکمل اور عصری اخبار بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ لیتھو کی پرانی مشینوں کی جگہ آفسیٹ کی نئی مشینیں آگئیں۔ اخبار کی اپنی عمارت بن گئی۔ تازہ ترین خبروں کے لیے پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے علاوہ یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جنوبی ہند میں "سیاست" ہی نے سب سے پہلے کمپیوٹر کے ذریعہ اردو کمپوزنگ کا آغاز کیا "سیاست" میں نئے نئے فیچر شروع کیے گئے۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے حیدر آبادیوں کے مسائل کو "سیاست" میں نہایت موثر انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس طرح دنیا بھر میں پھیلے ہوئے حیدر آبادی "سیاست" کی ڈور سے بندھ گئے۔ یورپ، امریکا اور مشرق وسطی کے ممالک میں لوگ جس بے چینی سے "سیاست" کا انتظار کرتے ہیں اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ "سیاست" آج ہندستان کا دوسرا کثیر الاشاعت اخبار بن گیا ہے۔ عابد علی خاں نے اپنے لیے اور اپنے اخبار کے لیے یہ مقام انتھک محنت اور لگن کے ذریعہ حاصل کیا۔ اُن میں بے پناہ عزم اور حوصلہ تھا۔ کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی جو بھی کام کرتے اس کے سارے گوشوں کا بغور جائزہ پہلے سے لے لیتے تھے۔

اردو اور حیدر آباد اُن کی دو بڑی کمزوریاں تھیں۔ حیدر آباد کو اردو کا سب سے بڑا مرکز بنانے میں ان کی کوششوں کو دخل تھا۔ میں سمجھتا ہوں برصغیر میں ادبی ٹرسٹ سے بڑا مشاعرہ کہیں اور نہیں ہوتا۔ اردو کے بیسیوں اداروں کی انھوں نے سرپرستی کی۔ سب کچھ کرنے کے باوجود انھوں نے کبھی بلند بانگ دعوے نہیں کیے۔ نمود و نمائش سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا۔ حکومت ہند کی گجرال کمیٹی کے وہ سب سے سرگرم رکن تھے۔ مجھے بھی اس کمیٹی کے شعبہ ریسرچ میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ عابد علی خاں صاحب کمیٹی کے ہر اجلاس میں شرکت سے پہلے کافی تیاری کر کے آتے تھے۔ اُن کی بے شمار ٹھوس تجاویز کو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں شامل کیا جن میں سے اکثر پر عمل بھی کیا گیا۔ کمیٹی کے صدر نشین جناب اندر کمار گجرال ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور ہر معاملے میں اُن سے مشورہ کرنے کو ضروری سمجھتے تھے۔

ترقی اردو بورڈ کے وہ برسوں رکن رہے۔ مجھے ترقی اردو بورڈ کی ایک میٹنگ اب تک یاد ہے جس کی صدارت اُس وقت کے وزیر تعلیم پی شنکر آنند کر رہے تھے۔ عابد علی خاں کو شکایت تھی کہ بورڈ کے اجلاسوں کی روداد کو صحیح ڈھنگ سے تیار نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے اگلی میٹنگ میں وہ اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لیتے آئے اور اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے مرکزی وزیر تعلیم سے نہایت سخت لہجہ میں کہا "مجھے وزارتِ تعلیم پر اعتراض ہے کہ وہ بورڈ کے اجلاس کی روداد کو صحیح طور پر مرتب نہیں کرتی۔ اسی لیے میں اپنا ٹیپ ریکارڈر اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں تاکہ آپ جو وعدہ کریں بعد میں اس سے مکر نہ جائیں"۔ عابد علی خاں صاحب کے اعتراض پر اجلاس میں سناٹا چھا گیا۔ بعد میں وزیر تعلیم نے وزارتِ تعلیم کے عہدیداروں سے خاصی بازپرس کی اور روداد کے غلط مرتب ہونے پر عابد علی خاں سے معافی مانگی۔ اردو کے معاملہ میں وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنی بات کو پوری بے باکی کے ساتھ کہنے کے عادی تھے۔ مخاطب چاہے کتنا ہی ذی اقتدار اور صاحبِ اثر آدمی کیوں نہ ہو۔

پریس ٹرسٹ آف انڈیا، سماچار بھارتی، قومی یک جہتی کونسل، پریس کونسل، ترقی اردو بورڈ اور دیگر اداروں کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے وہ اکثر دہلی آتے تھے۔ آنے سے پہلے وہ فون پر اپنی آمد کے بارے میں مجھے اطلاع ضرور دیتے تھے۔ جو ضروری ملاقاتیں پہلے سے طے ہوتی تھیں وہیں جاتے تھے۔ غیر ضروری طور پر وزراء، عہدیداران اور قائدین سے ملنے سے گریز کرتے تھے۔ اپنی خودداری اور انا کا انھیں بے حد احساس تھا۔ میں نے اردو کے ہی نہیں دیگر زبانوں کے اخباروں کے اڈیٹروں کو بھی دیکھا ہے جو دہلی آتے ہی اپنے تعلقات کو وسیع کرنے اور قائدین سے ملنے ملانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عابد علی خاں نے خود سے جا کر کسی وزیر یا عہدیدار سے ملاقات نہیں کی بلکہ اکثر اوقات یہی لوگ خود عابد علی خاں سے ملنے کے لیے آجاتے تھے بارہ برس پہلے تک ان کا معمول تھا کہ دہلی آتے تو رات کا کھانا پرانی دہلی کے کریم ہوٹل میں کھاتے تھے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں اپنے دوستوں کو بھی رات کے کھانے پر مدعو کروں۔ بعض دفعہ میرے دس بارہ دوست ان کے ساتھ رات کے کھانے میں شریک رہتے تھے۔ حکومت آندھرا پردیش کے کئی وزیر اور ارکان پارلیمنٹ بھی ان کی وجہ سے کریم ہوٹل کا رُخ کرتے تھے۔ قلب پر پہلے حملہ کے بعد وہ پرانی دہلی کے بجائے نظام الدین والے کریم ہوٹل میں جانے لگے تھے۔ بارہ سال پہلے دہلی سے حیدرآباد واپس جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں ہی ان کے قلب پر پہلا حملہ ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی دنوں تک دہلی نہیں آسکے۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو پھر دہلی آتے جانے لگے۔ یہی نہیں صدر جمہوریہ ہند اور وزیرِ اعظم کے ساتھ کئی بیرونی ملکوں کا دورہ بھی کیا۔ حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن کے سلسلہ میں منعقدہ تقاریب میں شرکت کے لیے لندن اور مشرقِ

وسطیٰ کے ممالک بھی گئے۔ ان میں ایک عجیب و غریب حوصلہ تھا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں اُن کے قلب پر کئی حملے ہوئے لیکن وہ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ اسپتال میں آرام بھی کرتے تو کئی منصوبوں اور تقاریب کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ گھر پر ہی رہنے لگے تھے۔ ہر دوسرے دن وہ حیدرآباد سے مجھے فون کیا کرتے تھے۔ پچھلے سال "سیاست" کے توسیعی لیکچر کے لیے انھوں نے ٹیلی ویژن کی مشہور آرٹسٹ نلنی سنگھ کو مدعو کیا تھا۔ اس جلسہ کا سارا کام انھوں نے گھر پر بیٹھے بیٹھے ہی کیا تھا۔ حیدرآباد اور اردو کے لیے ان کے ذہن میں کئی منصوبے تھے جن پر وہ عمل پیرا ہونا چاہتے تھے۔

انھوں نے ہمیشہ ضرورت مندوں، بیکسوں اور مسکینوں کی بے دریغ مدد کی لیکن کبھی اُن کی زبان پر اس مدد کا ذکر نہیں آتا تھا۔ میرے بے شمار دوستوں کے کام انھیں کی معرفت ہوئے۔ وہ نہایت منظم طریقہ سے کام کرنے کے عادی تھے۔ کسی کی سفارش کرنی ہوتی تو اُس کے بارے میں ایک کاغذ پر تفصیلات لکھ کر اپنی میز پر رکھتے تھے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوجاتا تھا تب تک وہ کاغذ ان کی میز پر ہی موجود رہتا تھا۔ جیسے ہی کام ہوجاتا، کاغذ کے اس پرزے کو پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ خدا نے انھیں ایک ایسا رتبہ اور اعتبار بخشا تھا کہ اُن کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ خالی نہیں جاتا تھا۔ بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار جو کام نہیں کرا سکتے وہ اُن کے ایک لفظ سے پورا ہوجاتا تھا۔ لفظ جب اُن کے منہ سے نکلتا تھا تو اس کی توقیر میں خود بخود اضافہ ہوجاتا تھا۔

اُن کے انتقال سے پہلے دو تین دنوں تک جب ان کا فون نہیں آیا تو مجھے تشویش سی ہوئی۔ میں نے حیدرآباد فون کرکے اُن کی خیریت پوچھی تو پتا چلا کہ بالکل خیریت سے ہیں اور گھر پر آرام کر رہے ہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے چند ہی گھنٹوں بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔ دوسرے دن علی الصبح اُن کے انتقال کی خبر ملی تو سکتہ سا طاری ہوگیا پہلی بار پتا چلا کہ بے سہارا ہونا کس کو کہتے ہیں۔ وہ جب تک زندہ رہے میں نے کبھی اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا تھا۔ دہلی میں رہتے ہوئے بھی ہمیشہ بھروسا یہ تھا کہ عابد علی خاں اس دنیا میں موجود ہیں۔ میری تعلیم سے لے کر میری بیٹیوں کی شادیوں تک ہر نجی معاملہ میں عابد علی خاں صاحب کی سرپرستی مجھے حاصل رہی۔ کوئی معاملہ ہوتا میں اس معاملہ کو اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر صاحب سے رجوع نہیں کرتا تھا بلکہ راست طور پر عابد علی خاں صاحب سے کہہ دیتا تھا۔ وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے انھوں نے آخر وقت تک میری کوئی بات نہیں ٹالی۔

انھیں میری زندگی کی روش اور لاپرواہیوں کا پوری طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے مخدوم محی الدین جب ہاؤزنگ بورڈ کے ممبر بنے تو انھوں نے مخدوم صاحب سے کہہ کر میرے لیے ایک مکان الاٹ کروایا تھا۔ لوگوں کے بارے میں کچھ اظہار خیال کیے بغیر پوری خاموشی کے ساتھ انھیں محسوس کرنے کا یہ انداز اُن کا اپنا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں جب میں نے دہلی

منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تو عابد علی خاں صاحب نے اس فیصلہ کی بھرپور حمایت کی۔ اخبار کے ملازمین کو جب بھی کہیں سے ملازمت کی اچھی پیش کش آتی تو وہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ دوسروں کی ترقی سے وہ ہمیشہ خوش ہوتے تھے۔ ان کے کچھ بدخواہ بھی تھے لیکن کبھی انھوں نے ان کے خلاف نہیں کہا۔ انھیں اپنی محنت اور اپنے بل بوتے پر پورا بھروسا تھا۔

وہ جب سے بیمار رہنے لگے تھے میں تقریباً ہر مہینہ حیدرآباد کا ایک چکر لگالیتا تھا۔ اگرچہ انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ عمر کی نقدی جلد ہی ختم ہونے والی ہے لیکن کبھی انھوں نے اپنی موت کے بارے میں اظہار خیال نہیں کیا۔ جب بھی ملتے یوں باتیں کرتے جیسے اور کئی برسوں تک زندہ رہیں گے۔ اصل میں وہ ایسی باتیں عیادت کرنے والوں کا دل رکھنے کے لیے کرتے تھے۔ اُنھیں اپنے سے کہیں زیادہ عیادت کرنے والوں کے جذبات کا خیال رہتا تھا۔

اُن کے دوست اور سابق مرکزی وزیر شیوشنکر صاحب نے یہ تجویز رکھی تھی کہ اُنھیں علاج کے لیے امریکا روانہ کیا جائے لیکن عابد علی خاں نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کردیا تھا۔ ۱۱ر اکتوبر کو اُن سے میری آخری ملاقات اسپتال میں ہوئی تھی۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے مجھے وداع کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ چہرہ پھر کبھی دکھائی نہیں دے گا۔ ۱۲ر نومبر کو شام کے وقت جب میں حیدرآباد پہنچا تو لوگ اُن کی تدفین کے بعد واپس آرہے تھے۔ اردو صحافت اپنے محسن سے اور حیدرآباد اپنے ایک عظیم سپوت سے محروم ہوگیا۔ عابد علی خاں کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہ ہوسکے گا کیونکہ عابد علی خاں جیسی شخصیتیں جن سانچوں سے بن کر نکلتی تھیں وہ سانچے اب ٹوٹ چکے ہیں۔

حسن الدین احمد
عزیز باغ ۔ نور خاں بازار
حیدر آباد

ایک عظیم صحافی

"بیت الامت"، بیگم بازار سے "دار السلام" کا فاصلہ ہو یا مغل پورہ میں "انتخاب جنگ کی دیوڑھی" سے "باغ مرلیدھر" کا فاصلہ جو بظاہر دو میل کا معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت میں زائد از ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ ان فاصلوں کو طے کرنا وسعت نظر فراست اور عزم کا کام ہے۔ اس کے لیے خلوص بھی چاہیے اور دل کی تڑپ بھی۔

جو با ہمت لوگ ایسے فاصلے طے کر لیتے ہیں ان کے لیے تہذیبوں کے فاصلے مذاہب کے فاصلے، رنگ و نسل کے فاصلے۔ نقاط نظر کے فاصلے کوئی حقیقت نہیں رکھتے وہ ایسی ہمہ گیریت حاصل کر لیتے ہیں جو تمام ذہنی فاصلوں کو نظر میں نہ لا کر اپنے اندر سمو لیتی ہے اور ایسا نقطہ مفاہمت بن جاتے ہیں جو متضاد نقطہ نظر رکھنے والوں کے لیے سر جوڑنے کا سامان مہیا کرتا ہے۔

۱۹۴۴ء میں جب حیدر آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور جشن یاد حالی کے لیے بابائے اردو مولوی عبد الحق حیدر آباد آئے تو قاضی عبد الغفار اور بابائے اُردو کو جن میں کشیدگی ہونے کے باعث اجتماع ضدین کہہ سکتے ہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا آسان بات نہ تھی جناب عابد علی خاں نے جو اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری تھے۔ اس بظاہر ناممکن بات کو ممکن بنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ محترمہ سروجنی نائیڈو اور مولوی ابو الحسن سید علی قائد مجلس اتحاد المسلمین نے بھی جلسہ میں شرکت کی۔ یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی۔

جب میں جناب عابد علی خاں کی زندگی اور ان کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ اُن کی زندگی میں جو تنوع تھا اس کا انھوں نے اس انداز سے اظہار کیا تھا کہ ان کی شخصیت مختلف رنگوں کی خوبصورت آمیزش اور مختلف طرز اور مکاتب کا حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔

اس بظاہر سادہ لوح منکسر المزاج اور پر سکون انسان کے دل میں جو تڑپ درد دھڑکنیں اور جذبات تھے۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس حیدر آباد کی تاریخ کو سمجھنا پڑے گا۔ جس کا ایک دور ختم ہو رہا تھا اور ایک دوسرا دور شروع ہو رہا تھا۔ کسی بھی ملک کے لیے اور کسی بھی

تہذیب کے لیے ایسا دور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن تبدیلی زمانہ کا مقدر ہے۔

یہ بظاہر عابد علی خاں کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوئے جبکہ جاگیردارانہ نظام اپنی افادیت کا دور ختم کرکے زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ انھوں نے جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اپنی افتاد طبع کے تحت نہ صرف عوام کے جذبات، واحساسات کو سمجھا بلکہ زمانہ کی نبض کو پہچانا۔ ان کو ایک دور کے ختم ہونے کا احساس تھا اور اس کا غم۔ لیکن کف افسوس ملنے سے وقت اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔ اس بات کو عابد علی خاں نے اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ آنے والے دور میں عوام کی امنگوں کو بھی دیکھ رہے تھے اور اس کا استقبال کرنا چاہتے تھے۔ یہ باتیں ان کے بزرگوں کی سمجھ میں آنے والی نہ تھیں جو نئے دور کے تقاضوں سے ناواقف تھے۔ ان کے نزدیک جاگیردار خاندان کا چشم وچراغ ایسے راستہ پر جا رہا تھا جو اس کے شایان شان نہ تھا۔ جو گھرانہ کی روایات کے خلاف تھا۔

میں نے کہا ہے کہ ایسے دور میں پیدا ہونا عابد علی خاں کی بدقسمتی تھی۔ جی ہاں بدقسمتی اس لیے کہ وہ اپنے بزرگوں کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ وہ جس کام کو زندگی کا مشن بنا کر انجام دینا چاہتے ہیں۔ وہ نہ صرف ان کے نام کو روشن کرے گا۔ بلکہ ملک کو بھی ایسے دور میں جبکہ بعض گوشوں میں اندھیرا چھایا ہو روشنی فراہم کرے گا۔ اپنے فکر وخیال کی انفرادیت اور بزرگوں کی ناراضگی کے تردد وفکر کے باعث انھیں مرض دق لاحق ہوگیا لیکن قدرت کو تو ان سے کچھ کام لینا تھا۔ کاش جاگیردار طبقہ کے افراد کو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے پاس وہ خزانے موجود ہیں جن کی نئی دور کو حاجت ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ وہ اپنے آئینہ خانوں سے باہر آئیں اور ہوا کے رُخ کو پہچانیں۔ دور جدید ان کا خیر مقدم کرتا۔ ان کی قدر کرتا۔ جو بات عابد علی خاں کے لیے بدقسمتی تھی اس کو انھوں نے اپنے طرز عمل سے ملک اور قوم کے لیے خوش قسمتی کا موجب بنا دیا۔

جب نئے دور کی تعمیر میں قدیم روایات، اقدار اور اصولوں کے مسالے فراہم ہوتے ہیں تو یہ نئے دور کی خوش بختی ہے۔ یہ مسالے عابد علی خاں نے فراہم کیے۔ جناب عابد علی خاں کا تعلق جنوبی ہند کے مایہ ناز خاندان اہل نائط سے ہے۔ ان کے جدا علی شاہ محمد حسن علی نائطی المعروف بہ ڈولچی شاہ سے نواب ناصر الدولہ بہادر فرماں روائے دکن کو عقیدت تھی۔ ڈولچی شاہ کا وصال ۱۲۸۴ھ ہجری میں ہوا۔ نام پلی میں ان کا مزار ہے۔ ڈولچی شاہ کے فرزند نواب ناصر علی خاں تھے۔ جن کو نواب افضل الدولہ فرماں روائے دکن کی اتالیقی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ نواب ناصر علی خاں کے دو فرزند عابد علی خاں (صولت جنگ) اور حافظ علی خاں (انتخاب جنگ) تھے۔ اول الذکر عابد علی خاں کے نانا اور موخر الذکر ان کے دادا تھے۔ ہر دو کو میر محبوب علی خاں کی کم سنی کے زمانہ میں ان کی اتالیقی کا اعزاز ملا۔ شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا نے اپنے ہمعصر نواب انتخاب جنگ کا ذکر اپنی شہرآفاق تصنیف تاریخ النوائط میں کیا ہے۔

نواب محمود علی خاں کے چوتھے فرزند عابد علی خاں تھے جو ۱۹۲۰ء میں بمقام حیدرآباد پیدا

ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں پائی۔ میٹرک کے بعد اس دور کے روایتی طریقہ پر نظام کالج میں داخلہ کی بجائے جامعہ عثمانیہ کا رخ کیا۔ یہ ان کی عوامی زندگی سے وابستگی کا پہلا اظہار اور ایک اہم اقدام تھا۔ جس نے ان کے مستقبل کے رُخ کو متعین کیا جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کے دوران انھوں نے علمی، ادبی سیاسی اور سماجی تحریکات سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اس دوران میں ان کی ملاقات مخدوم محی الدین سے ہوئی اور ترقی پسند ادبی تحریک سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں فلسفہ سے بی اے کی تکمیل کی۔ ہم دونوں ایک ہی زمانہ میں اقامت خانہ الف میں تھے۔

گریجویشن کی تکمیل کے بعد مولانا سید شاہ صابر حسینی صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ خاموش کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی۔ اس تقریب میں نواب میر عثمان علی خاں فرماں روائے دکن نے شرکت فرمائی۔ یہ بات اس زمانہ میں باعث اعزاز تھی۔

جناب عابد علی خاں کے والد کی خواہش تھی کہ وہ سرکاری ملازمت حاصل کریں۔ مگر ان دنوں عابد علی خاں پر عوامی اور ترقی پسند تحریکات کا اثر بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں جب کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اُٹھادی گئی اور پارٹی کی پہلی کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی تو انھوں نے مخدوم محی الدین کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ وہ پارٹی رکن نہ تھے لیکن ہمدرد ضرور تھے۔ بمبئی میں ان کو سجاد ظہیر کے پاس ٹھہرایا گیا۔ پروفیسر نورالحسن کا قیام بھی وہیں تھا۔ علی سردار جعفری سبط حسن اور دوسرے کئی ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ ان ہی دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے تو ان جلسوں میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب جناب عابد علی خاں پر ہمیشہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر زور نے اُردو کانفرنس اعلا پیمانہ پر منعقد کی جس میں سر شیخ عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، سر محمد یعقوب کے علاوہ غیر منقسم ہندستان کے کئی نامور ادیب و شاعر جمع تھے۔ ڈاکٹر زور نے ترقی پسند ادب کے شعبہ کا کنوینر عابد علی خاں کو مقرر کیا۔ جس کی صدارت سجاد ظہیر نے کی۔ جناب عابد علی خاں اس وقت محکمہ نشر و اشاعت میں ترقی کر کے مددگار ناظم ہو چکے تھے۔ ان کے والد ان کی سرگرمیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اعلا عہدہ داروں کو بھی شکایت تھی کہ وہ کمیونزم سے قریب ہو رہے ہیں انھیں روکا جائے لیکن جہاں لگن اور دھن کا یہ عالم تھا۔

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں
بھائی "عابد" تو کچھ دوانے ہیں

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ۱۹۴۸ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور روزنامہ سیاست کے اجرا و اشاعت کے لیے درخواست دے دی۔ ان کے بائیں بازو کے خیالات کے باعث یہ اجازت ذرا تاخیر سے منظور ہوئی۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۹ء سے اخبار سیاست کا اجرا عمل میں آیا جن روایات اقدار اور اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کو عابد علی خاں نے سیاست کی

بنیاد میں بڑی فراخ دلی سے استعمال کیا۔ خاندانی وجاہت اب دیوڑھی سے نکل کر ایک عوامی اخبار کی سرشت بن گئی۔ دوستی خلوص اور ہمت سے ایسے کارکن فراہم کیے جو اپنی جگہ ادارہ اور تاریخ ساز شخصیت ہیں۔

"سیاست" نے گذشتہ ۴۳ سال میں اپنا جو مقام پیدا کر لیا وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ لیکن عابد علی خاں نے اپنے خاندانی وقار کو جس انداز سے زندہ جاوید بنا دیا۔ ہے وہ محسوس کرنے کی چیز ہے VISUALISE کرنے کی چیز ہے۔ بے لوث خدمت اور سیاسی جماعتوں سے غیر وابستگی کے باعث ان کو ہمیشہ دانشوروں کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل رہی۔ جناب عابد علی خان نے اپنی زندگی میں جو نمایاں کام کیے اور جو اعزازات حاصل کیے وہ اہل حیدر آباد کے لیے باعث فخر ہیں۔ ان کا احاطہ کسی مضمون یا سلسلہ مضامین میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ایک کتاب کی ضرورت ہے اور یہ کتاب اہل حیدر آباد اور اہل اردو پر قرض ہے۔

ڈاکٹر سید محمد حمید الدین شرفی
۲۱-۴-۸۴۲/۷۔ حسینی عالم
کوکا ٹٹی۔ حیدرآباد

"جناب عابد علی خاں مرحوم۔ بحیثیت مدیر"

(اردو ریسرچ اسکالرس کونسل کے زیر اہتمام بہ عنوان " عابد علی خاں صاحب کی اردو صحافت کے لیے خدمات" شنبہ ۹ جنوری ۱۹۹۳ء ۱۱ بجے دن ایوان اردو پنجہ گٹہ میں منعقدہ سیمینار کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ۔)

جناب عابد علی خاں مرحوم حیدر آباد کی چیندہ شخصیات میں ایک خاص حیثیت رکھتے تھے وہ جاگیر دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ بہترین ماحول میں تعلیمی مراحل طے کیے امیرانہ ٹھاٹ باٹ اور رئیسانہ روایات کے پروردہ ہونے کے باوجود سرمایہ دارانہ ذہنیت سے دور ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے۔ اطراف و اکناف کی آرام طلبی، سہولت پسندی بے کاری، تساہلی اور جمود سے یکسر بیزار اور خوب محنت و مشقت کرنے والے تھے۔ ہر دم متحرک، مصروف اور سرگرم رہا کرتے تھے۔ کام اور مسلسل جہد سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جامعہ سے فراغت اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جو میدان چنا وہ محنت، مسلسل محنت اور بے تکان کام و نیز ہر لحظہ حرکت چاہتا تھا۔ جناب عابد علی خاں مرحوم چوں کہ محنت و مصروفیت کے طالب تھے اسی وجہ سے میدان صحافت میں خوب جم کے بے پناہ کام کیا اور صحافت کے کاروان کو آگے بڑھانے میں مقدور بھر لیکن کامیاب کوشش کی۔ حیدر آباد میں اردو صحافت کی ہمہ جہت ترقی کے لیے تقریباً نصف صدی تک منہمک رہے۔ طبعی میلان نے ان کی تمام تر دلچسپیوں کو اس شعبہ سے ایسا وابستہ کر دیا کہ ان کی زندگی کا محور، مقصد اور فکر و عمل کا ہر زاویہ اس سے متعلق رہا۔ وہ صحافی کے علاوہ بہت کچھ تھے لیکن پورے ملک اور بیرون ملک واقف حلقوں میں محض صحافت کے وسیلہ سے اپنی شناخت رکھتے تھے۔

جناب عابد علی خاں مرحوم اردو صحافت کو اپنے فکر و فن سے وقار عطا کرنے والے عظیم المرتبت صحافیوں کے سلسلہ کی متاخر مضبوط اور اہم کڑی تھے۔ وہ حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے بعد سے تادم زیست اردو صحافت سے منسلک و متعلق رہے۔ ان کی روزنامہ سیاست کے وسیلہ سے اردو صحافت کے لیے گراں قدر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

صحافتی اقدار کو بلندی اور استحکام بخشنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ایک ایسے وقت

اپنے کو انھوں نے اس شعبہ سے وابستہ کیا جب کہ اس جانب عام توجہ نہیں تھی۔ پولیس ایکشن سے قیام آندھرا پردیش تک کے عبوری دور میں حیدرآباد اور اہلیان حیدرآباد ایک عجیب وغریب صورت حال سے دوچار تھے اس وقت انھیں سنجیدہ، دردمند اور باوقار رہنمائی کی سخت ضرورت تھی ایسے وقت جناب عابد علی خاں نے اپنے اخبار کے وسیلہ سے اس ذمہ داری کو نہایت استقلال، عزم اور عمدگی کے ساتھ پورا کیا ایک ذمہ دار شہری، ایک بے لاگ صحافی اور ایک دردمند انسان کی حیثیت سے انھوں نے اہل وطن کی بر موقع خدمت انجام دی۔

اردو صحافت میں پرسنل جرنلزم (PERSONAL JOURNALISM) کی روایت شروع ہی سے ملتی ہے۔ اخبار کا مدیر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اخبار کے ہر صفحہ، ہر کونے، ہر کالم بلکہ ہر سطر پر اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جب کہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے اخبارات میں ملکیت اور انتظامیہ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ سیاسی دھڑے، نظریاتی گروہ، تجارتی ادارے اور صنعتی گروپ اپنے افکار ونظریوں کی اساس پر اخبارات نکالتے اور چلاتے ہیں وہاں مدیر کی حیثیت محض ملازم کی سی ہوتی ہے اسے مالکین یا انتظامیہ کی پالیسیوں کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ یہاں استثنیات سے بحث نہیں۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ملکوں میں اکثر اخبارات میں اڈیٹر کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی ہفتوں شائع نہیں ہوتی۔ سارا کام اس کے شرکاء اور معاونین انجام دیتے ہیں اس کے باوجود اخبار کے تمام شعبوں، مواد اور ظاہری صورت گری میں اس کی دماغی صلاحیتوں اور محنت کا تمام تر دخل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ

"مدیر کی قوت فیصلہ، ذہانت، تجربے اور قابلیت سے سارا اخباری نظام وابستہ ہوتا ہے۔"

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جناب عابد علی خاں مرحوم ان تمام خصوصیات سے متصف تھے۔ وہ بے حد طباع، لائق، باصلاحیت، مضبوط ارادے والے اور صائب الرائے تھے قوت فیصلہ اور عمل کے لحاظ سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

ابتدا میں وہ حیدرآباد سے نکلنے والے کئی اخبارات سے وابستہ رہے انھوں نے ترجمہ کا کام کیا۔ نیوز اڈیٹر کی خدمت انجام دی اور منتظم کی حیثیت سے اخبارات کے انتظامی امور کا تجربہ حاصل کیا۔ پیام اور رعیت میں کام کے دوران انھوں نے اس میدان میں عملی طور سے بہت کچھ سیکھا جوان کے تجربات کو پختہ اور مشاہدات کو گہرا بنانے کا باعث ہوا۔

صحافت سے فطری لگاؤ کے باعث انھوں نے ایک ایسے ماحول میں اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا جب کہ سارے ملک میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ انضمام حیدرآباد کے بعد یہاں کے حالات دگرگوں تھے۔ ہر طرف جھوٹی افواہوں کا زور تھا بلاشبہ صحافت کا جو رول تھا وہ اپنے معیار گنوا چکا تھا۔ ملک کے ہر صوبے سے اردو اخبار ورسائل نکلتے

تھے مگر حیدر آباد کو ان میں ایک سبقت حاصل تھی۔ پولیس ایکشن سے پہلے یہاں تحریک آزادی اور تحریک رضا کار میں تصادم اور جذباتیت کی بنا پر بعد المشرقین تھا۔ مقاصد کے محدود دائرے اور قیادت کی "انا" نے حالات کے بگاڑ میں اپنا ساحصہ لیا۔ صحت مند اور رہنما صحافت وقت کی ضرورت تھی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو عابد علی خاں مرحوم نے نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ روزنامہ سیاست جاری کیا۔ حیدر آباد کے افق صحافت پر نمودار ہونے والا یہ روزنامہ شروع میں مختلف قیاس آرائیوں کا نشانہ بنا رہا لیکن بہت جلد اپنے موسس کے سلیقہ، دور اندیشی، تدبر، جہد عمل، اصابت رائے ہی نہیں بلکہ نپے تلے لب و لہجہ، تدوین و ترتیب کے ڈھنگ اور پیشکشی کے انداز کے سبب قارئین کے ایک اچھے خاصے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کر گیا۔ صرف دو دہائیوں کے اندر اندر اس کا حلقہ اثر حیدر آباد کے علاوہ ملک کے اکثر علاقوں تک پھیل گیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے دور دراز ملکوں میں بھی سیاست کے پڑھنے والوں کے چھوٹے بڑے حلقے قائم ہوتے چلے گئے۔

عابد علی خاں صاحب نے مسلسل ۴۳ سال تک اپنے اخبار کے وسیلہ سے اردو صحافت کی خدمت انجام دی۔ وہ یقیناً ترقی پسند نظریات کے حامل تھے لیکن بہ حیثیت صحافی وہ کسی خاص سیاسی دھڑے یا جماعت سے وابستہ نہ تھے وہ فرسودگی جہالت اور انتہا پسندی، قدامت پرستی کے مخالف تھے۔ اپنی خدمات اور اپنے اخبار کو انھوں نے ہمیشہ غیر جانب دار رکھا۔ وہ اردو صحافت کے ہر محاذ پر سرگرم عمل رہے اور جو کچھ بھی کیا پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ کیا۔ ان کے افکار و خیالات صاف ستھرے تھے۔ وہ زبان و قلم کی شائستگی اور فکر و عمل کی شرافت کے قائل تھے ان کا یہ رویہ ہمیشہ قائم رہا۔ انھیں اخبار نویسی کے رموز و نکات سے کما حقہ واقفیت تھی۔ فن صحافت کے تمام پہلوؤں پر ان کی گہری نظر تھی۔ قاضی عبد الغفار مرحوم اور نرسنگ راؤ صاحب کے ساتھ کام کرنے کے سبب وہ ابتداء ہی سے اردو صحافت اور اس کی اہمیت، ضرورت اور اثر و رسوخ کے تمام گوشوں سے پوری طرح جانکاری رکھتے تھے یہی بات آگے چل کر ان کی خاص اس شعبہ میں وسیع تر اور موثر خدمات کا باعث بنی۔

صحافت کے بے شمار پہلو ہیں۔ اخبار اپنے کئی خصوصی اور ناگزیر زاویوں کے سبب پڑھنے والوں کے نزدیک اپنی اہمیت بنائے رکھتا ہے۔ اس ضمن میں اداریہ نگاری کی مثال دی جا سکتی ہے۔

"اداریہ نگاری ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ذریعہ مدیر واقعات و حالات کا تجزیہ کرتا ہے اس کا مقصد رائے عامہ کی تشکیل ہے ملک و قوم اور معاشرہ کے نت نئے مسائل اداریوں کے لیے زمین فراہم کرتے ہیں۔ اداریوں کے ذریعہ قارئین کی مثبت یا منفی جہتوں میں رہنمائی ممکن ہے۔ اداریوں کی رائے زنی، مسائل کی تشریح و تفہیم

اور اچھے مقاصد کی ترویج اور قاری کو غور و فکر کا عادی بنانے میں اہم حصّہ لیتی ہے۔

جناب عابد علی خاں مرحوم نے اس ادارہ یعنی اداریہ نگاری کے ذریعہ اردو صحافت کی اعلا روایات کو آگے بڑھانے میں خوش رنگ نقوش چھوڑے ہیں۔ اداریہ نگار کو حالات سے زیادہ سے زیادہ با خبر رہنا لازمی ہے۔ حقائق کی تہ تک پہنچنے متوقع نتائج کا اندازہ کرنے اور اجتماعی زندگی کی نفسیات سے واقف ہونے کی صلاحیت رکھنا ضروری ہے۔ مرحوم ان تمام خصوصیات سے بہرہ مند تھے۔ ان کی رائے حکومت کو بھی متوجہ رکھتی تھی۔ وہ جوش و ولولہ کے بجائے متانت و سنجیدگی سے مسائل کے مثبت پہلوؤں کو ابھارنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عابد علی خاں مرحوم کا یقین تھا کہ اشتعال انگیزی سے اجتناب ہی معاشرہ کی صحیح خدمت ہے انھوں نے اپنے اداریوں کے ذریعہ نیک مقاصد کے فروغ اور نقصان رساں نظریات کی تردید میں کوئی کوتاہی نہ برتی ان کی تحریریں صحت مند رجحانات کو پروان چڑھانے میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔

جناب عابد علی خاں مرحوم اس نکتہ کو بخوبی سمجھتے تھے کہ سماج کے مختلف طبقات اور گروہوں میں آپسی موانست اور موافقت کے استحکام کے ضمن میں اداریوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ اگر منفی لب و لہجہ اختیار کیا جائے تو تباہی کی آگ بھڑک سکتی ہے اردو صحافت کے روایتی اخلاقی رویوں کی انھوں نے ہمیشہ پاسداری کی۔ انتہا پسندی اور جذباتیت کے بجائے سلجھاؤ اور تدبّر کا راستہ دکھا کر اداریوں کے اخلاقی رویوں کو اعتبار بخشا۔ کسی بھی صورت حال کے متعلق قاری کی رائے کو صحیح خطوط پر لانے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں عابد علی خاں صاحب نے اداریوں کے ذریعہ موثر کام لیا۔ وہ مدلل اور جذباتی اداریوں میں سے اول الذکر کے حامی رہے۔ وہ ہمیشہ سادہ اور سلیس زبان میں اداریے لکھتے تھے۔ ان کے معاونین بھی کبھی کبھار اس شعبہ سے متعلق رہے لیکن سیاست کے اداریوں پر ہمیشہ عابد علی خاں صاحب کی فکری چھاپ نمایاں رہی۔

ماضی میں صحافت کا دائرہ محدود تھا اس لیے موضوعات بھی کم تھے اخبار کے تمام شعبوں کا کام ایک یا دو آدمی بہ آسانی سنبھال لیتے تھے آج صحافت کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے موضوعات میں تنوع ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اداریہ نگاری ایک ٹیم کے تفویض ہوتی ہے ان میں ہر ایک، اپنے خاص موضوع کا ماہر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسا کم ہے بلکہ اردو صحافت میں اس کا ابھی رواج نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا روزنامہ سیاست کے اداریے جناب عابد علی خاں مرحوم لکھا کرتے تھے یا ان کے دیرینہ رفیق کار جناب محبوب حسین جگر اس شعبہ میں ذمہ دار ہیں۔ اداریہ نگاری کے ضمن میں انھیں اخبار کی پالیسی ہمیشہ پیش نظر رکھنی پڑتی وہ ذاتی جذبات و خیالات کے بجائے اخبار کے مسلمہ لائحہ عمل اور نقطۂ نظر کو اہمیت دیا کرتے تھے۔

عابد علی خاں مرحوم وسیع المطالعہ تھے ان کی یہ عادت ایک حد تک ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ مختلف علوم سے مناسب طور پر واقفیت رکھتے تھے وہ بے حد محنتی تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ سست رو آدمی ادارت ہی نہیں زندگی کے کسی بھی شعبہ میں چل نہیں سکتا۔ وہ اپنے قارئین کے مزاج داں تھے وہ حالات پر گہری نظر رکھتے تھے انھیں بجا طور پر باخبر مدیر اور چوکنا صحافی کہا جا سکتا ہے۔ وہ مسائل کی نوعیت اور اہمیت کا صحیح ادراک کرتے اور غور و فکر کے عادی تھے۔ وہ خود کو معاشرہ کا خادم سمجھتے اور صحیح و متوازن رائے دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

جناب عابد علی خاں کو اداریہ نگاری کے ضمن میں انتخاب موضوع پر بڑا کمال تھا اس کے بعد مواد کی فراہمی اور تحریر ان کے لیے مشکل نہ تھی اکثر وہ باہمی مشورے سے بھی اس منزل کو طے کر لیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مسائل حاضرہ واقعات اور اعلانات وغیرہ ان کے لیے موضوع اور مواد فراہم کرتے ہیں۔ اپنے اخبار کے فائیل، حوالے کے رسالوں۔ لائبریریوں اور انسائیکلو پیڈیا سے بھی کارآمد مواد حاصل کر لیتے۔ کسی بھی کہنہ مشق اداریہ نگار کی طرح ان کے اداریوں میں سرخی اور مضمون میں بڑی مطابقت ہوا کرتی وہ کسی خبر کی تلخیص سے یا کبھی واضح اور کبھی مبہم اشاروں سے اداریوں کو اہم بنا دیتے تھے۔ انھیں مختصر اداریوں سے دلچسپی تھی۔

جناب عابد علی خاں مرحوم بہ حیثیت مدیر اخبار میں دو جگہوں پر نمایاں طور پر جلوہ گر ہوا کرتے یعنی اداریوں یا سرخیوں میں ان کی فنی آگہی پورے کمال کے ساتھ نظر آتی ہے کسی بھی خبر کے لیے عنوان قائم کرنا شعور و پختگی کی علامت ہے۔ خبروں کے متن پر کسی کا بس نہیں کہ تبدیلی کرے البتہ اڈیٹر یا ادارہ کو بوقت تدوین شائع کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ سرخی خبر کی مناسبت سے دی جاتی ہے۔ روزنامہ سیاست میں چھپنے والی خبروں کی سرخیاں بلاشبہ اخبار سیاست کی پالیسی اور عابد علی خاں مرحوم کے نظریات و افکار کی بھرپور عکاسی کرتی رہی ہیں۔

خبروں کے علاوہ مضامین فیچرز، رپورتاژ اور تبصروں وغیرہ کی سرخیوں سے مضمون یا فیچر کا تعارف ہوتا ہے۔ سرخی در اصل خبر، مضمون، فیچر یا رپورٹ کا خلاصہ پیش کرتی ہے سیاست کی ہر سرخی، اس کے مدیر کے کمال فن کی آئینہ داری کرتی رہی ہے۔ عابد علی خاں مرحوم سرخیوں سے اخبار کی تزئین اور خوب صورتی میں اضافہ کا کام بھی لیا کرتے تھے لوگ سرخی سے خبر کے اہم یا غیر اہم ہونے کا اندازہ لگانے میں بالعموم محض سرخی پڑھ کر ہی خبریں دلچسپی لیتے ہیں ورنہ اس پر اکتفا کر لیتے ہیں اس بات کا انھیں شدید احساس تھا اس وجہ سے ان کی سرخیاں سہل، عام فہم، قاری کی توجہ کو سمیٹنے والی، پرکشش اور اخلاقی حدود کی پابند ہوا کرتی تھیں۔ الفاظ کی تکرار، طوالت، روکھے پن، سنسنی خیزیت اور غیر صحت مند اسلوب سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرخی

کا فوراً ردعمل ہوتا ہے اس لیے ہر شمارہ میں اس احتیاط کو ملحوظ رکھا کرتے تھے مثلاً

کسی مسجد کا کوئی شکستہ کنگرہ بارش، ہوا یا بوسیدگی سے خود بخود گر پڑا ہو، اور وہ زمانہ فسادات یا کشیدگی کا ہو اور اخبار یہ سرخی جمادے کہ "مسجد کا مینار توڑ دیا گیا" تو اس سرخی کا جو منفی ردعمل ہوگا اس کی مضرت رسانی اور شدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عابد علی خاں صاحب اس صورت میں حقیقت حال کو مثبت انداز سے پیش کرتے ہیں۔ یقین رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ سنسنی خیز سرخی دے دینے کے بعد دوسرے دن اس کی تردید بھی شائع کی جائے تو لوگ توجہ نہیں دیں گے اور اس کا وہ اثر بھی نہیں ہوگا۔

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ فسادات کے زمانے میں انگریزی اخبارات میں ایک ہنگامہ خیز سرخی کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی تھی جو اس طرح تھی "اقلیتی فرقہ کی کی جانب سے ایک مسجد سے متصل مکان میں بم بنائے جارہے ہیں" اس خبر کے لحاظ سے جو دھماکو خیز سرخی جمائی گئی اس کا فوری ردّعمل جو ہونا تھا وہ ہوا۔ عوام کے مختلف طبقات میں کھنچاؤ اور غلط فہمیاں پھیل گئیں لیکن جب حکومت اور دوسری ایجنسیوں کی طرف سے تحقیقات کی گئی تو پتا چلا کہ "پٹاخے بنانے کا ایک کارخانہ تھا جہاں پٹاخے بنائے جارہے تھے" چوں کہ یہ کارخانہ مسجد کے بازو واقع تھا لہٰذا اخبارات نے اسے ایک نیا رخ دے دیا۔ ایسی خبر کے لیے بھی سیاست نے اپنے خاص انداز سے سرخی جمائی اور اپنے امتیاز کو برقرار رکھا۔

آپ جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں چند برسوں قبل ایک افواہ اڑائی گئی تھی کہ گنڈی پیٹ (تالاب عثمان ساگر) کا بند ٹوٹ گیا ہے اس کا اس قدر شدید اثر ہوا کہ پورا شہر بھاگم بھاگ نقل مقام میں مصروف ہوگیا۔ بڑے ہنگامے ہوئے، لوگوں کا بہت سارا نقصان بھی ہوا حالاں کہ خبر بالکل جھوٹ اور محض افواہ تھی جب افواہ کا یہ اثر ہوسکتا ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی اخبار کی سرخی کا کیا زبردست اثر ہوگا۔ عابد علی خاں صاحب نے اشتعال انگیز خبروں کو ہمیشہ احتیاط کے ساتھ شائع کیا۔ سرخیوں کے بارے میں اعلا صحافت کے ضابطۂ اخلاق کی نہ صرف یہ کہ پابندی کی بلکہ اس کو استحکام بخشا۔ اغواء جبری توہین جیسی خبروں میں کبھی بھی لڑکی یا عورت کا نام نہیں دیا۔ مذہبی امور میں ہر وقت احتیاط برتی۔ ہتک آمیز خبروں کی اشاعت سے گریز کیا۔ وہ مانتے تھے کہ ضابطہ اخلاق دراصل اخبار اور قاری کے درمیان ایک باہمی اور شریفانہ سمجھوتہ ہے جو لوگ صحافت کے ان اعلا اصولوں کی پابندی نہیں کرتے وہ دوسروں کی آزادی میں مداخلت کرتے اور سماج کی مجموعی بدخدمتی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنی غیر ذمہ دارانہ حرکات سے کسی فرد، جماعت یا فرقہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایسا کرنا زرد صحافت کی علامت ہے۔ عابد علی خاں صاحب

کی صحافیانہ زندگی کا سارا زمانہ اس لعنت سے دور رہا۔ زرد صحافت سے ان کا دامن کبھی آلودہ نہ ہو سکا۔

زرد صحافت کے اسباب و وجوہ اور اصل بنیاد سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اخبار کی لاگت اور قیمت فروخت کے غیر متوازن فرق سے اس کا سلسلہ جڑا ہوتا ہے کاغذ، کتابت، طباعت اور اجرت ترسیل کے جملہ اخراجات کا لحاظ کیا جائے تو اخبار جتنے میں بکتا ہے وہ اس کی لاگت سے کہیں کم قیمت ہوتی ہے۔ ہر روز اخبار کی نئی قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ محض نقصان کی بنیاد پر اخبار چلایا نہیں جا سکتا۔ ان وسیع اخراجات کی پابجائی کا وسیلہ اشتہارات کی آمدنی پر ہوتا ہے۔ جن اخبارات کو اچھے اور زیادہ اشتہار ملتے ہیں وہ نہ صرف کامیابی سے چلتے ہیں بلکہ ان کا رویہ معتدل ہوتا ہے جب اخبارات کو اس کے برعکس حالات کا سامنا ہو تو دوسرے ہتھکنڈوں سے اخراجات پورے کرنے کی کوشش ہوتی ہے جس کے سبب زرد صحافت معرض وجود میں آتی ہے۔ عابد علی خاں صاحب دیانت داری، خلوص، محنت اور اپنے صاف ستھرے صحافتی رویوں سے ہمیشہ خود کو اور روزنامہ سیاست کو اس آلودگی سے بچاتے رہے۔

جناب عابد علی خاں کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ اپنی غیر معمولی وجاہت، اثر ورسوخ زور قلم اور سماجی مقام و مرتبہ کے باوجود وہ اپنے عظیم مشن یعنی اردو صحافت کے ارتقاء و استحکام کے لیے ہمہ تن کوشاں رہے۔ اپنے اخبار کے وسیلہ سے انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ہندستان بھر میں بہت کم اردو اخبارات ہیں جنھوں نے اپنی اشاعت کے مسلسل ۴۳ برس پورے مکمل کیے ہیں۔ روزنامہ سیاست بلاشبہ ان چند گنے چنے اخبارات میں شامل ہے جس کی عمر ۴۳ سال اپنے موسس کے سامنے ہو چکی تھی۔ جہاں تک صوری اور معنوی حیثیت کا سوال ہے یہ ملک بھر کا پہلا خوب صورت، آراستہ، مزین اور معیاری اردو روزنامہ ہے جو اپنے مدیر موسس کی عظیم الشان صحافتی خدمات کا آئینہ دار ہے۔

تڑپ رہا ہے فلاطون میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

ڈاکٹر انور معظم
۸/ ۱۸۷-ٹلی بلی-حیدرآباد

عابد صاحب

عابد علی خاں صاحب کی زندگی تین وابستگیوں سے عبارت ہے... اردو، حیدرآباد اور روزنامہ سیاست۔ اردو کو انھوں نے ہندستانی تہذیب کا ترجمان سمجھا اور بہ حیثیت ایک علمی اور تعلیمی زبان کے اردو کی صلاحیت پر پکا یقین رکھتے تھے۔ حیدرآباد کی تہذیب اور تاریخ پر انھیں ہمیشہ فخر رہا، اور روزنامہ "سیاست"، کو خبرو نظر کا سچا، موثر اور طاقتور ذریعہ بنانا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

ایک اردو اخبار چلانا اور اردو صحافت میں ایک معیار قائم کرنا، دو مختلف باتیں ہیں۔ ملک میں ان گنت اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کے اڈیٹر اخبار کو اس طرح شائع کرتے ہیں جیسے کسی جنرل اسٹور کو چلا رہے ہوں۔ جنرل اسٹور کو کامیابی سے چلانے کے لیے کسی خاص اہلیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دکان میں گاہکوں کی ضرورت کی ہر چیز موجود رہے۔ ان اخباروں میں بھی کچھ ایسا ہی مواد جمع رہتا ہے۔ اخبار چلتا ہے تعداد اشاعت چاہے کم ہو، مگر اتنے اشتہارات مل جاتے ہیں کہ اخبار چھپ جاتا ہے اور کچھ پیسا بچ بھی جاتا ہے۔ سرکار اور شہر میں جو اہمیت ملتی ہے وہ اپنی جگہ۔ اس کے مقابلے میں صحافتی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اور کسی مقصد کے لیے اخبار جاری رکھنا، مشکل کام ہے۔ ایسا اخبار محض مالی منافع یا ذاتی اہمیت حاصل کرنے کی خواہش پر منحصر نہیں ہوتا۔ عابد علی خاں صاحب نے ۱۹۴۹ء میں ایک اچھے عہدے سے استعفا دے کر جب "سیاست"، نکالنے کا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ ان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا اور ایسا انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد کے حالات میں ایک اردو اخبار کی اشاعت کا خیال اسی شخص کے ذہن میں آسکتا تھا جو اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے کوئی نتیجہ خیز تحریک شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ یقیناً روزنامہ "سیاست"، کا آغاز ایک صحافتی تحریک کا آغاز تھا۔ تحریک اردو والوں کو دنیا میں مسلسل مربوط رکھنے کی، اُن کی رائے سازی کی، انھیں ہندستانی تہذیب، سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی۔ اس تحریک میں اُن سستے حربوں اور ترکیبوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی جن کو استعمال کرکے تعداد

اشاعت بڑھائی جاتی ہے۔ مثلاً سنسنی خیزی، کردار کشی، جذباتیت۔ عابد علی خاں صاحب نے "سیاست" کو ایک سنجیدہ، ذمہ دار اور معروضی نقطۂ نظر رکھنے والا روزنامہ قرار دیا۔ مالی اور شخصی مفادات کو نظر انداز کیا۔ قومی تہذیب اور قومی مفادات کا تناظر اخبار کی ہر رائے کی تشکیل میں سب سے بڑا رول ادا کرتا رہا۔ اردو زبان کا براہ راست تعلق مسلمانوں سے بھی رہا ہے۔ لیکن "سیاست" کے اداریوں میں مسلمانوں کے مسائل پر بھی ہمیشہ قومی تناظر ہی میں اظہار خیال کیا گیا۔ سیاست آزاد پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے۔ اس پالیسی کو عابد علی خاں صاحب اور ان کے دستِ راست جناب محبوب حسین جگر نے اخبار کے آغاز ہی کے وقت تشکیل دے دیا تھا۔ آزاد پالیسی اختیار کرنے سے زیادہ کٹھن اسے برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یکے بعد دیگرے حکومت کے دباؤ اور بعض وقت عتاب اور مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی گروپوں کی ناراضگی اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عابد علی خاں صاحب نے کسی سیاسی یا مذہبی جماعت یا حکومت سے کبھی کوئی سمجھوتہ بازی نہیں کی۔ "سیاست" کے اداریے یہی ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کسی اخبار کی پالیسی مکمل طور پر اس کے مالک کے نقطۂ نظر پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر کوئی مالک پڑھا لکھا ہو تو پھر یہ پالیسی اخبار کے مالک اور اڈیٹر کے باہمی مشورے سے بنتی ہے۔ عابد علی خاں سیاست کے مالک بھی تھے اور اڈیٹر بھی۔ سیاست کی آزاد پالیسی کے بنانے میں ان کی رائے فیصلہ کن رہی ہوگی۔

اس پالیسی نے سیاست کو ہندستان کا سب سے مہذب، معتدل اور باخبر روزنامہ بنانے میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ اگرچہ تعداد اشاعت کے اعتبار سے "سیاست" ملک میں دوسرے نمبر پر ہے لیکن صحافتی اقدار اور معیار کی برقراری کے اعتبار سے یہ ملک کا سب سے اہم اردو اخبار تسلیم کیا جاتا ہے۔

عابد علی خاں صرف اس لیے "سیاست" کے اڈیٹر نہیں تھے کہ ان کا نام آخری صفحے کی آخری سطر میں چھپ جاتا تھا۔ وہ اڈیٹر یوں تھے کہ وہ سچ مچ روزنامہ "سیاست" کو "ایڈٹ" کرتے تھے۔ اداریہ نگاری کے علاوہ یہ طے کرنا کہ اخبار کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک کوئی خبر، بیان، مضمون، اشتہار کہاں کتنی جگہ میں اور کس سرخی کے ساتھ ساتھ ہوگا، عابد صاحب کی ذمہ داری تھی۔

جو لوگ عابد صاحب کو قریب سے جانتے ہیں وہ اتفاق کریں گے کہ "سیاست" کی آزاد پالیسی عابد علی خاں صاحب کی شخصیت میں آزادی کی صفت پر اصرار سے عبارت ہے سیاست میں جو کچھ شائع ہوتا رہا اور مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں وہ جس طرح کام کرتے رہے، اس میں انھوں نے ہمیشہ اپنی صلاحیتِ فیصلہ کو استعمال کیا ہے۔ اپنی سوچی سمجھی رائے دی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کبھی شخصیات کے دباؤ میں نہیں آئے۔ چاہے وہ شخصیت کسی دوست کی ہو، وہ عہدیدار ہو یا کوئی وزیر،

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا رویہ آمرانہ ہوتا تھا۔ بعض وقت ان کے دو ٹوک بات کرنے کا انداز ایک قسم کی رعونت کا تاثر دیتا تھا۔ شروع شروع میں مجھے بھی ایسا ہی لگا۔ لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ عابد صاحب نہایت صاف و شفاف آدمی ہیں۔ جہاں اپنے لیے اپنی رائے قائم کرنے کے حق پر اصرار کرتے تھے وہیں دوسروں کے لیے بھی ایسے حق کو ملتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں، ساتھیوں، اخبار کے قارئین، اجنبی ملاقاتیوں کی باتوں، تبصروں، تنقیدوں کو بھی بغور سنتے۔ اسے قبول کرتے یا پھر خاموش ہو جاتے۔ بہر صورت وہ اپنے بات کرنے والے پر سب سے پہلا تاثر جو قائم کرتے وہ یہ کہ انھیں اپنے پر بلا کا اعتماد ہے اور جیسے وہ بات کرنے والے سے کہہ رہے ہوں کہ "میں آپ سے مشورہ نہیں مانگ رہا ہوں۔ پھر بھی اگر آپ مشورہ دینا چاہتے ہوں تو ضرور ایسا کیجیے۔ میں آپ کی بات سُن رہا ہوں۔ بات ماننے پر اصرار مت کیجیے۔ اچھی بات ہوگی تو شکریے کے ساتھ قبول کروں گا نہ مانوں تو بُرا مت مانیے۔"

عابد علی خاں صاحب سے ہر ملاقات خوشگوار ہوتی تھی۔ ایک پُر اعتماد شخص سے بات کریں تو یہ اعتماد اپنے میں سرایت ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی دوسری خصوصیت ان کی رجائیت تھی۔ میں نے کبھی انھیں اُداس، فکر مند یا مایوس نہیں دیکھا۔ ملک کے بعض اہم واقعات، اردو زبان کے نازک موقف، فرقہ پرستی یا فسادات پر ان سے گفتگو کئی بار ہوئی۔ ہمیشہ انھوں نے یہی کہا کہ اس کے لیے ہم جو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ کرنا چاہیے۔ حیدرآباد میں اور قومی سطح پر گجرال کمیٹی اور دوسرے قومی اداروں میں انھوں نے اردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے ہمیشہ لڑائی کی اور ٹھوس تجاویز پیش کرتے رہے۔ حیدرآباد میں اردو ہال اور اردو گھر کی تعمیر میں عابد صاحب کا بڑا حصّہ رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عابد صاحب کے تعاون کے بغیر اردو ہال، اردو کالج اور اردو گھر کا وجود میں آنا ممکن نہیں تھا۔

روزنامہ "سیاست" ایک اخبار سے ایک ادارے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی میں محبوب حسین جگر، عابد علی خاں کے ہمزاد کی طرح ہر جگہ موجود ہیں، گو نظروں سے اوجھل ہیں۔ "سیاست" میں کام کرنے والے انتہائی مخلص، ذہین اور محنتی کارکن شروع سے اس تبدیلی کو ممکن بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس اہم مہم کو سرانجام دینے میں رہنما عابد صاحب ہی رہے ہے۔ حیدرآباد میں اردو کی تمام ادبی اور سماجی سرگرمیاں عابد صاحب کے دم سے قائم تھیں۔ جب بھی کوئی مشاعرہ، سیمینار یا کانفرنس منعقد کرنا ہوتا تو لوگ عابد صاحب ہی سے مدد مانگتے۔ عابد صاحب نے ہر اچھے اور نتیجہ خیز کام کرنے کے لیے دستِ تعاون پیش کیا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کی آمدنی سے شہر کے متعدد علمی اور تعلیمی اداروں کی نازک موقعوں پر مدد کرنا، عابد صاحب کی ایجاد ہے۔ مشاعروں سے پیسہ اکٹھا کرنا اور اکٹھا ہوئے والی آمدنی کو اداروں کے حوالے کرنا...... غالباً اردو زبان و

ادب کی تاریخ میں پہلی بار یہ کام ہوا ہے۔

میں نے مضمون کے شروع میں کہا ہے کہ عابد علی خاں صاحب کی زندگی تین وابستگیوں سے عبارت ہے ..... اردو، حیدرآباد اور روزنامہ "سیاست"۔ بظاہر انھوں نے اپنی زندگی کا کام آسان کر لیا تھا لیکن ذرا سوچیے۔ اپنی زندگی کے بارے میں زندگی کے اوائل میں کوئی فیصلہ کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے جن مقاصد سے اپنے عشق کا رشتہ جوڑا اور کیسے جہتم بالشان مقاصد ہیں۔ کسی زبان، کسی تہذیب سے عشق اور ان دونوں کو زندہ رکھنے کے لیے ایک اعلا ترجمان کو تخلیق کرنا اور باقی رکھنا ...... یہ کسی معمولی ذہن کے بس کی بات نہیں۔

"سیاست"، عابد علی خاں صاحب مرحوم کی زندگی تھا۔ اب وہ ان کی یادگار ہے لیکن عجیب بات ہے کہ انھوں نے یہ وصیت کی کہ "سیاست" میں ان کی تعزیت کی خبریں یا ان پر مضامین شائع نہ کیے جائیں۔ بہ حیثیت اڈیٹر غالباً یہ اُن کی آخری ہدایات تھیں۔ ایسا انھوں نے کیوں کہا تھا؟ اس کا جواب مجھے ان کی آخری گفتگو سے ملا۔ ان کے انتقال سے تین چار دن قبل میں ان سے گھر پر ملا۔ وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ ٹرانسسٹر پر خبریں سن رہے تھے۔ ایک دو بار "سیاست" کے آفس سے فون آیا تو ہدایات دیں۔ کچھ خاموش خاموش تھے۔ ایک بات سے بہت فکرمند تھے "جگر پر بہت بار پڑ گیا ہے"۔ پھر میں نے اس دن کے اخبار کے اداریے کا ذکر کیا۔ ہنستے رہے۔ میں خاموش ہوا تو میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں بڑی اداسی اور ٹھہراؤ تھا۔ بولے "اخبار میں ہمارا کیا ہوتا ہے؟ ایک چھوٹی سی جگہ۔ باقی سب تو عوام کا ہے ہم تو اپنی مرضی سے کسی خبر کی سرخی بھی نہیں لگا سکتے"۔ وہ مان چکے تھے کہ "سیاست"، اب ان کا اخبار نہیں رہا۔ یہ سفاک حقیقت شناسی، یہ بے نیازی جہاں اُن کے آخری سفر کے آغاز کی غماز تھی وہیں صحافت میں عوامی ذمہ داری کے اصول کا ایک فلسفیانہ اعتراف بھی ہے۔

اپنے کارناموں سے اپنے کو الگ کرنے کا یہ ظرف.....!

کے۔ناگیشور راؤ
کیراف روزنامہ سیاست
حیدرآباد

اخوت اور رواداری کا علم بردار

عابد علی خاں کے انتقال کے ساتھ ہی اردو صحافت ایک ایسی مرصّع شخصیت سے محروم ہوگئی جس نے کہ مسلمانوں کو قومی دھارے کے ساتھ ساتھ بہانے کی انتھک کوشش کی۔ وہ ایک دانشور اور قوم پرست مدیر تھے۔ صحافت کی اقدار کو انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ پوری صحافتی زندگی میں وہ سیکولر اقدار اور ترقی پسندی کے علمبردار بنے رہے۔

عابد علی خاں ایک خوش حال، دولت مند خاندان کے فرد تھے لیکن وہ ہمیشہ مجبوروں اور مظلوموں کے پشت پناہ بنے رہے۔ شرعی قوانین، کشمیر کے مسئلے یا مندر مسجد تنازعے میں جہاں کئی اردو اخبارات نے انتہائی کٹر پن اور اساسیت پسندی کا موقف اختیار کیا وہاں سیاست نے ہمیشہ قوم پرستانہ اور بسا اوقات ترقی پسندی کا موقف اختیار کیا۔

عابد علی خاں کے لیے صحافت ایک مقصد حیات تھا۔ انھوں نے سیاست کا اجرا ایسے وقت کیا جب کہ نظام حیدرآباد کے خلاف تیز و تند جمہوری جدّوجہد ختم ہوچکی تھی۔ اس وقت سیاست نے مسلمانوں کے جائز اور واجبی حقوق کی زبردست مدافعت کی اور مسلمانوں کو اساسیت پسندی کے چنگل سے باہر نکالنے کی پوری کوشش کی۔ عابد علی خاں اردو کے ایک ممتاز انقلابی شاعر مخدوم محی الدین کے قریبی ساتھی بن گئے اور ترقی پسندی کی تحریکوں میں آگے آگے رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے وہ سکریٹری رہے اور کئی بڑی شاندار کانفرنسیں منعقد کیں۔

پندرہ اگست ۱۹۴۹ء کو پہلے اداریے میں عابد علی خاں نے لکھا تھا کہ "غرض شہرت حاصل کرنا نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایک آواز اٹھے۔ ترقی پسند مصنّفین کو اظہار کے لیے ایک وسیلہ فراہم کیا جائے۔ یہ اخبار ذات پات، عقیدے، مذہب یا کسی سیاسی پارٹی کی سمت کوئی جھکاؤ نہیں رکھتا۔ یہ بالکلیہ ایک غیر جانب دار اخبار ہوگا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ صحت مند جمہوری روایات کو فروغ دیا جائے اور مذہب سے بالاتر ہوکر صرف انسانیت کا تحفظ کیا جائے۔"

نہایت اعتماد کے ساتھ اپنی پہلی اداریتی تحریر میں انھوں نے لکھا تھا کہ "مجھے کامل یقین ہے کہ اس مقصد میں مجھے کامیابی ملے گی میں روشنی پھیلانا چاہتا ہوں"۔

سیاست کے اجراء سے قبل اردو صحافت کی صد سالہ تاریخ یہ تھی کہ وہ سرکاری سرپرستی میں ہی زندہ رہ سکتی تھی یہ بھی حقیقت ہے کہ نظام کی حکومت ختم ہوتے ہی کئی اردو روزنامے بند ہوگئے کیوں کہ وہ سرکاری سرپرستی سے محروم ہوگئے تھے۔ ان حالات میں سیاست کا اجرا ٹین کے ایک شیڈ میں ہوا۔ ناقدین نے مایوسیوں کا اظہار کیا لیکن عابد علی خاں سیاست کو ملک کا ممتاز اخبار بنا دینے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اب بھی جب کہ کئی اردو اخبار کتابت کے عہد میں ہیں۔ سیاست میں پوری کارروائی کمپیوٹرس کے ذریعہ ہوتی ہے۔

عابد علی خاں کی سیکولر اقدار صرف تحریر کی حد تک ہی محدود نہیں تھیں۔ سیاست میں کئی غیر مسلم ورکرس ہیں جو اس ادارے سے وابستگی کا اور انھیں حاصل سہولتوں کا بڑے فخر کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ یہ روزنامہ دسہرہ، دیوالی اور دیگر مذاہب کے تہواروں پر خصوصی ضمیمے شائع کرتا ہے۔ اس سے بھی اخبار کے سیکولر کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شہر میں بدترین فرقہ وارانہ فسادات میں جہاں کئی مسلم ادارے نشانہ بنتے رہے "سیاست" کو کسی نے چھوا تک نہیں۔ اس روزنامے کے ایک سینیئر سب ایڈیٹر نے بتایا کہ ایسے وقت بھی جب کہ مذہبی تقاریب فرقہ وارانہ فسادات بھڑکا دینے کا موجب بنی تھیں اس وقت بھی "سیاست" نے دیگر مذاہب کی اقدار کو اجاگر کرنے والے مضامین کی اشاعت کی تھی۔

عابد علی خاں نے قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ خیرسگالی کے پرچم کو ہمیشہ بلند رکھا حساس مسائل پر جب بھی انھوں نے قلم اٹھایا تو اس وقت بھی انھوں نے اساسیت پسندوں کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کی اور مدلل طور پر منفرد انداز میں اپنی بات کہی۔

شاہ بانو کیس میں جب اردو کے کئی اہم اخبارات نے کسی نہ کسی رجعت پسندی کا مظاہرہ کیا، عابد علی خاں نے اس وقت بھی کھلے انداز میں ترقی پسندانہ موقف اپنا کر شرعی قوانین میں اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے شرعی قوانین کی منفرد توضیح و تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام تو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ہے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کے قوانین میں لچک پیدا کرنے کی شرعی گنجائش موجود ہے۔

کشمیر کے بارے میں ان کی رائے بالکل واضح تھی۔ روزانہ وہ اپنے روزنامے کے ذریعے یہ پرچار کرتے کہ کشمیر ہندستان کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ مندر مسجد کے تنازعے میں انھوں نے ایک مصالحتی حل کی بات کہی تھی۔ اس کی بنا پر اساسیت پسند مسلمان

ناراض ہوتے اور وہ "سیاست" کو ایک "سرکاری اخبار" کہتے رہے۔

عابد علی خاں نے کئی ملکوں کی سیاحت کی۔ وہ اپنے علم و فضل اور کشادہ ذہنی کے لیے مشہور تھے۔ وہ کمیونسٹ تو نہیں تھے لیکن کانگریسیوں سے زیادہ کمیونسٹوں سے قربت رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ کسی پارٹی کے ساتھ ان کی شناخت بنے۔ حد یہ کہ انھوں نے حیدر آباد پارلیمانی حلقے سے امیدوار بنائے جانے کی ایک پیش کش تک کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے کارل مارکس کی تصنیف "اجرتی مزدور اور سرمایہ" (WAGE LABOUR AND CAPITAL) کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ چین کے دورے کے بعد انھوں نے "ڈیموکریٹک چائنا" (DEMOCRATIC CHINA) اور "گریٹ مین آف چائنا" (GREAT MEN OF CHINA) دو تصانیف لکھی تھیں۔ ان کا یہ ٹھوس ایقان تھا اور تحریر میں انھوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ سوشلزم اگرچہ کہ سوویت یونین میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن سوشلزم کا نظریہ اصول اور تھیوری اب بھی زندہ اور برقرار ہے۔

ورکنگ جرنلسٹوں سے ان کا تعلق نہایت قربت کا تھا۔ عابد علی خاں کی زیر ادارت "سیاست" کو مشتہرین سے مکمل تعاون حاصل رہا اور مالیہ کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ "سیاست" کے ایڈیٹر جگدیش کا بیان یہ ہے کہ "ہمیں ہماری اجرتیں ہمیشہ وقت پر مل جاتی ہیں اور جب بھی ہمیں کچھ ضرورت پڑ جاتی تھی تو ہمارے صاحب ہمیں پیشگی بھی دے دیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہم سے ہمارے ذاتی مسائل کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور پدرانہ شفقت اور محبت کے ساتھ ہمارے مسائل حل کر دیتے تھے۔"

"عابد علی خاں سبھی کے دوست تھے، دشمن کسی کے نہ تھے"۔ ایک ممتاز جرنلسٹ ڈی سیتارام نے مدیر "سیاست" کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے بارے میں یہ بات کہی "سیاست" کو ایک سنجیدہ سلجھے ہوئے اور نہایت باخبر اخبار ہونے کا مقام حاصل ہے۔ اس کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ اس کے لیے لکھنے والے متنوع ہیں ان میں سے اکثر غیر مسلم ہیں جو کہ بہت اچھی اردو جانتے ہیں۔

عابد علی خاں کا احساس یہ تھا کہ کسی مقصد، کسی نصب العین کے بغیر ایک اخبار کا وجود یا عدم وجود برابر ہے۔ مشاعروں کے انعقاد کے ذریعے انھوں نے لاکھوں روپیا اکٹھا کیا اور اس رقم کو اردو ادب کی ترقی اور غربت زدہ افراد اور اچھے شاعروں کی امداد پر خرچ کیا۔ اردو ادب، فرقہ وارانہ خیرسگالی اور حیدر آباد کی رنگا رنگ مخلوط تہذیب کے فروغ کے لیے کئی ٹرسٹ قائم کیے۔

حکومت نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ شہر حیدر آباد کی تاسیس کا جشن اُسے منانا چاہیے لیکن عابد علی خاں نے خود ہی شہر حیدر آباد کی تاسیس کے چار سو سالہ جشن منانے کی ابتدا کر دی۔ اس کے لیے انھوں نے "جشن گولکنڈہ سوسائٹی" تشکیل دی اور تہذیبی پروگرام میں شرکت کے لیے دنیا کے مختلف حصوں سے مشہور آرٹسٹوں کو مدعو کیا۔

عابد علی خاں ایک خداترس اور مذہبی انسان تھے۔ اپنے اخبار کے ذریعے ہمیشہ انھوں نے یہی بات کہی کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے۔ فرقہ وارانہ خیر سگالی کے فروغ کو انھوں نے خصوصی طور پر ملحوظ رکھا۔ یہی سبب ہے کہ غیر مسلموں کی اکثریت بھی اسے پڑھتی ہے۔

"سیاست" کے ایک سب اڈیٹر شاہد عظیم نے بتایا کہ کسی کے تقرر سے قبل عابد علی خاں اس بات کی اچھی طرح چھان بین کر لیتے تھے کہ وہ سیکولر ذہن اور کردار کا حامل ہے یا نہیں۔ زاہد علی خاں، مینجنگ اڈیٹر "سیاست" جو عابد علی خاں کے بڑے فرزند ہیں انھوں نے کہا کہ روزنامے کی پالیسی تبدیل نہیں ہوگی اور عابد علی خاں نے جو راہ متعین کی ہے اس پر سفر جاری رہے گا۔

عابد علی خاں نے صحافت اور ترسیل و ابلاغ سے متعلق تعلیم و تربیت کے فروغ میں بھی بڑی دلچسپی لی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ڈپارٹمنٹ آف جرنلزم کے سربراہ پروفیسر ایس بشیر الدین نے عابد علی خاں کو جو کہ بورڈ آف اسٹڈیز کے صدر بھی تھے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "وہ ایک ممتاز قوم پرست تھے اور ایک ایسے صحافی اور مدیر تھے جو کہ اردو صحافت اور حیدر آباد کی رنگا رنگ مخلوط تہذیب کے بہترین نمایندہ تھے"۔

حکومت ہند نے ۱۹۸۱ء میں عابد علی خاں کو پدم شری کا اعزاز دیا اور پریس کونسل کا رکن مقرر کیا۔ حال ہی میں انھیں نو تشکیل شدہ نیشنل اڈیٹرس کمیٹی کا بھی رکن مقرر کیا گیا تھا۔ آندھرا پردیش اوپن یونی ورسٹی نے بھی انھیں اعزازی ڈگری دی تھی اور آل انڈیا نیوز پیپر اڈیٹرس کانفرنس نے بھی انھیں ایوارڈ دیا تھا۔

چند سال قبل جب وہ قلب پر حملے کا پہلی بار شکار بنے تو انھوں نے ایک وصیت تیار کر دی تھی اور اسے اپنے ایک قدیم اور معتبر خدمت گار کے پاس رکھوا دیا تھا۔ اس وصیت میں جو اُن کے انتقال کے بعد دیکھی گئی لکھا تھا کہ ان کے انتقال کر جانے کے سلسلے میں کوئی رسومات ادا نہ کی جائیں۔ چہلم پر خرچ ہونے والی رقم کسی غریب مستحق لڑکی کی شادی کے لیے دے دی جائے۔ عابد علی خاں تمام زندگی جن اصولوں پر عمل اور پرچار کرتے رہے انتقال تک بھی اُن ہی اصولوں پر قائم اور عامل رہے۔

ہاشم سعید
معرفت روزنامہ "سیاست"
جواہر لال نہرو روڈ، حیدرآباد

عابد علی خاں ــــ ایک جہدِ مسلسل

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
(جگرؔ)

حصول آزادی کے بعد ملک کے حالات بہت کچھ بدل گئے اور کئی لوگ ایسے تھے جو اپنی زبان اور تہذیب کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن ذوق عمل نہ ہونے کے باعث آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ کسی محفل کے ایک گوشے میں چند لوگ گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ بزم اُردو میں نئی شمع جلانا ہے مجھے۔ دوسرے نے کہا باغ اُردو کے خس و خاشاک جلانا ہے مجھے اور پھر بات آگے نہ بڑھ سکی تاہم حیدرآباد میں ایک فرد واحد اُٹھا اور اس نے دونوں کام کر دکھائے۔ اس فرد واحد کا نام عابد علی خاں تھا۔ انھوں نے جب بزم اُردو میں نئی شمع جلائی تو عوام کے ہاتھوں میں روزنامہ سیاست پہنچ گیا اور جب باغ اُردو کے خس وخاشاک کو انھوں نے جلایا تو قدیم حیدرآباد کے محلہ مغل پورہ میں اُردو گھر کی دو منزلہ عمارت نمودار ہوئی۔ ادارہ ادبیات اُردو کو نئی زندگی ملی۔ انوار العلوم کالج میں نئے نئے نصاب شروع کیے گئے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں گوشہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اُردو تعلیم کے لیے تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا گیا۔

عابد علی خاں نے روزنامہ سیاست کو ۱۵ر اگست ۱۹۴۹ء کو جاری کیا۔ اس وقت ان کے پاس قلیل سرمایہ بھی نہ تھا۔ ان کے پاس آبا و اجداد کا ایک خنجر تھا جس کا قبضہ سونے کا تھا اور اس پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ عابد علی خاں نے اس کو اور چند اشرفیوں کو جو ان کے پاس تھیں فروخت کر دیا۔ اس زمانے میں سونا ۵۰ روپے تولہ کے حساب سے ملتا تھا۔ چند ہزار روپے عابد علی خاں کے پاس آ گئے۔ انھوں نے ایک افتادہ زمین کرایہ پر لی اور اس پر ٹین کا سائبان لگوایا۔ برابر ہی وجاہت پرنٹنگ پریس کا "فادر لیتھو پریس" تھا جس کو انھوں نے اقساط پر خریدا اور احسان ناخدا کا اُٹھائے

مری بلا کہتے ہوئے سیاست کا پہلا شمارہ شائع کر دیا۔ سیاست کی پہلی تعداد اشاعت ۷۵۰ تھی لیکن دوسرے دن گھٹ کر ۵۰۰ ہو گئی اور پھر دس دن کے اندر ۲۵۰ ہو گئی۔ اخبار کو اشتہارات نہیں مل رہے تھے اور جو اشتہارات ملتے ان کا معاوضہ نہیں ملتا۔ سکندر آباد کے ایک مشہور تاجر پارچہ کا اشتہار سیاست میں شائع ہونے لگا مگر پیشہ وارانہ رقابت نے بعض لوگوں کو اس تاجر پارچہ سے سیاست کی شکایت کرنے پر مجبور کیا کہ سیاست میں اس کا اشتہار انتہائی خراب چھپ رہا ہے۔ ابتدا میں اخبار سے احسن علی مرزا وابستہ رہے لیکن ایک مہینے کے اندر ہی انھوں نے علاحدگی اختیار کی۔ مرزا صاحب کی نشست پر راقم الحروف کو بٹھایا گیا لیکن "قد آور مرزا صاحب" کے مقابلہ میں راقم الحروف ایک "بونا" نظر آنے لگا۔ پورا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ ہر ایک کو محنت کرنی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں حالات پر قابو پانے میں کامیابی ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ راقم الحروف کو اخبار سے ماہانہ ۷۵ روپے اور جائنٹ اڈیٹر جگر صاحب کو ۱۰۰ روپے ملتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عابد علی خاں اس سے کئی ماہ تک محروم رہے۔ لوگوں نے عابد علی خاں کو موٹروں میں گھومتے دیکھا ہے لیکن ابتدا میں اگر چھپائی کا مشین خراب ہو جاتا تو کسی دوسرے چھاپہ خانے میں چھپوائی کا انتظام کرنا پڑتا۔ عابد علی خاں کو اطلاع دی جاتی اور وہ گھر سے سیکل پر دفتر پہنچتے اور دوسروں کی طرح سیکل کے کیریر پر اخباری کاغذ لیے دوسرے پریس کو جاتے۔ سابق مالک پرنٹنگ پریس نے مشین کی کفالت پر قرضہ حاصل کیا تھا اور اس کو ادا نہیں کیا تھا۔ قرض دہندہ نے عدالت سے ڈگری حاصل کی اور چھاپہ خانہ کو مہر توڑا لگوا دیا۔ یہ صورت حال اتنی اچانک سامنے آئی کہ سب کے ہوش اڑ گئے۔ مالک مشین قرضہ کی رقم ادا کرنے کے موقف میں نہیں تھا۔ یہ مصیبت بھی عابد علی خاں پر آئی کہ وہ دو ہزار روپے عدالت میں داخل کر دیں۔ عابد علی خاں سیکل لے کر نکل پڑے اور کسی نہ کسی طرح دو ہزار روپے کا انتظام کیا اور رقم عدالت میں داخل کی۔ چار بجے شام عدالت کے حکم پر مہر توڑا ختم کر دیا گیا اور پانچ بجے سے پریس ورکرز کی آمد شروع ہو گئی۔ اگر دو ہزار روپے کا انتظام نہ ہوتا تو جو مشکلات پیدا ہوتیں اور جو بدنامی ہوتی اسے سوچ کر آج بھی ہنسی آتی ہے۔ سیاست کا دفتر جگر صاحب کا گھر بن گیا تھا۔ راقم الحروف دن میں ایک بجے دفتر آتا اور رات میں تین بجے گھر واپس ہوتا تھا۔ رات کے کھانے کا انتظام ایک قریبی ہوٹل کو ماہانہ پندرہ روپے ادا کر کے کیا جاتا تھا۔ گرمی کے موسم میں ٹین کی چھت تپ جاتی اور برسات میں پانی دفتر سیاست میں داخل ہو جاتا۔ اس پانی میں کاغذ کی کشتیاں چلانا بڑا آسان تھا۔ ایک مرتبہ کامریڈ شہاب دفتر سیاست چلے آئے تھوڑی ہی دیر میں زبردست بارش ہونے لگی ٹین کے چھت کو "بمبو" کی مدد سے ایک جانب عابد علی خاں صاحب نے اور دوسری جانب جگر صاحب نے سہارا دیا تاکہ پانی اوپر سے ہی چلا جائے اور دفتر سیاست کے اندر نہ گرے۔ کامریڈ شہاب نے پوچھا عابد اور جگر "بمبو بردار" کیوں ہو گئے ہیں؟ شاہد صدیقی کی رگ مزاح پھڑک اٹھی۔ انھوں نے

جواب دیا دھواں دار بارش آسمان میں سوراخ ہو جانے کا نتیجہ ہے اور یہ دونوں بمبوں کی مدد سے اسی سوراخ کو بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دفتر سیاست میں تینوں موسم اسی طرح گزرا کرتے تھے۔

حیدرآباد کے اخبارات میں آخری کاپی رات میں گیارہ بجے چھپنے کے لیے دی جاتی تھی اور ادارتی عملہ گھر چلا جاتا تھا مگر سیاست میں ادارتی عملہ ۲.۳۰ بجے شب تک کام کرتا رہتا تھا جس کی وجہ سے قارئین کو صرف سیاست میں تازہ ترین خبریں روزانہ ملتی تھیں اس کی وجہ سے سیاست کی تعداد اشاعت بڑھنے لگی اور نہر سویز کی لڑائی کے وقت یہ تعداد چھے ہزار سے تجاوز کر گئی۔ ایک لیتھو پریس کی جگہ پانچ لیتھو پریس اخبار چھاپنے لگے۔ بعد میں آفسٹ مشین خریدا گیا اور پھر ۱۹۷۹ء میں روٹری آفسیٹ مشین خریدا گیا جو اخبار کے تمام صفحات کو وقت واحد میں ایک گھنٹہ میں ۲۰ ہزار شائع کر دیتا ہے۔ عابد علی خاں کو دھن تھی کہ سیاست کو ملک کا صف اول کا اخبار بنایا جائے اور چالیس سال کی انتھک کوشش نے انھیں مقصد کے حصول میں کامیابی دلائی۔

سرسید نے جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے لیے کام شروع کیا تو انھیں سب سے بڑی مشکل مالیہ کی پیش آئی۔ سرمایے کی قلت ہر شخص کو کسی بھی کام کے آغاز پر پیش آتی ہے۔ عابد علی خاں کو یہ دھن تھی کہ زبان اور تہذیب کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ اقدام کیا جائے۔ ابتدا میں اخبار سیاست اس قابل نہ تھا کہ ان کی اس ضرورت کی تکمیل کر سکے۔ انھوں نے سوچا کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے اس لیے انھوں نے زبان اور تہذیب کی حفاظت کے لیے زبان ہی کا سہارا لیا۔ انھوں نے سوچا کہ مشاعرے منعقد کر کے سرمایہ جمع کیا جائے چنانچہ انھوں نے پہلا مشاعرہ سروجنی دیوی ہال رام کوٹ میں منعقد کیا۔ ہال صرف نصف کی حد تک بھر سکا تھا۔ اخراجات کی پابجائی کے بعد چند روپے بچ گئے۔ دوسرے سال ہال تنگ دامانی کا شکوہ کرنے لگا تو تیسرے سال انھوں نے اسی ہال کے کمپاونڈ میں مشاعرہ منعقد کیا جس میں مجروح سلطان پوری نے بھی شرکت کی تھی۔ جب وہ غزل سنانے کھڑے ہوئے تو سامعین میں سے کسی نے طنز کرتے ہوئے ان سے ان کے لکھے ہوئے فلمی گیت "سی اے ٹی کیاٹ۔ کیاٹ معنی بلی" سنانے کی فرمائش کی۔ مجروح نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یہ گیت کسی سرمایہ دار کی خواہش پر لکھا تھا اور غزل صاحب ذوق اصحاب کو سنانے کے لئے یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ عابد علی خاں نے اپنی اسکیم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ادبی ٹرسٹ قائم کیا جس کے لیے بڑے پیمانہ پر مشاعرے آج بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں اردو اکیڈیمی ۱۹۷۶ء میں قائم ہوئی مگر عابد علی خاں کا ادبی ٹرسٹ ۱۹۶۰ء سے ہی کام کرنے لگا تھا اس کے پہلے صدر نواب مہدی نواز جنگ تھے۔ ادبی ٹرسٹ کے مقصدی مشاعروں کا مقصد اردو زبان اور اردو تہذیب کی بقا کے لیے سرمایہ جمع کرنا ہے۔ چنانچہ ۲۸ مشاعروں کے ذریعہ کئی لاکھ روپے جمع کیے گئے۔ مشاعروں کی آمدنی سے مغل پورہ میں اردو گھر

کی دو منزلہ عمارت تعمیر ہوئی۔ ادارہ ادبیات اردو جو جاں بلب ہو گیا تھا اس کے لیے ایک بڑا کارپس قائم کیا گیا جس کی وجہ سے وہ سکون کے ساتھ سانس لینے کے قابل ہو سکا۔ انوار العلوم کالج کو مالی امداد دی گئی تاکہ وہ نئے کورس شروع کر سکے۔ اُردو تعلیم کے لیے اردو مدارس کا قیام ضروری ہے۔ اس کے لیے عابد علی خاں نے اردو تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا جس کے باعث اُردو ہال اور اردو گھر میں دو اردو مدارس کام کر رہے ہیں ان مدارس کے بچے ساتویں جماعت اور دسویں جماعت کے امتحانات میں اُردو میڈیم سے شرکت کرتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام ہندستان میں ایک انقلابی اقدام تھا لیکن آزادی کے بعد اس انقلابی اقدام کی نوعیت بدل گئی اور عثمانیہ یونی ورسٹی کی اپنی شناخت کھو گئی۔ عابد علی خاں نے اس کی کوشش کی کہ آنے والی نوجوان نسلوں پر یہ واضح کیا جائے کہ جامعہ عثمانیہ کس طرح قائم ہوا اور اس کی خصوصیت کیا تھی اس کے لیے انھوں نے ارباب یونی ورسٹی کے تعاون سے عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری میں "ویژن آف عثمانیہ" قائم کرایا۔

عابد علی خاں نے ابنائے وطن کو کسی بھید بھاؤ کے بغیر بے حد چاہا اور ابنائے وطن نے بھی ان کی قدر و منزلت کی انھیں صحافت کا غالب ایوارڈ دیا گیا۔ حکومت نے انھیں پدما شری کا اعزاز عطا کیا اور آندھرا پردیش یونی ورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ وہ کئی انجمنوں کے رکن رہے۔ اردو زبان کے تعلق سے حکومت ہند کی قائم کردہ گجرال کمیٹی کے وہ روح رواں بنے ہوئے تھے۔ پریس کونسل کے بھی رکن رہے۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے ڈائرکٹر اور ہند سماچار کے بانی ڈائرکٹر تھے۔ خرابی صحت کی وجہ سے وہ قومی یکجہتی کونسل کے اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکے۔ انھیں بلدیہ حیدرآباد کے رکن کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ شہر حیدرآباد کے قیام کے چار سو سالہ جشن کے انعقاد میں انھوں نے پہل کی چونکہ ریاستی حکومت گذشتہ تین سال سے جشن منانے کا اعلان کر رہی ہے لیکن جشن منانے سے گریز کر رہی ہے۔ سال گذشتہ ۳۰ نومبر کو حکومت نے جشن حیدرآباد چار مینار پر منانے کا اعلان کیا لیکن چند دن بعد اعلان کو منسوخ کر دیا۔ عابد علی خاں نے مقررہ تاریخ ۳۰ نومبر کو چار مینار کے دامن میں شاہ علی بنڈہ جانے والی سڑک پر ایوان شاد کا مشاعرہ منعقد کرایا جس کو ہزارہا افراد نے سننے سے زیادہ حیرت و استعجاب سے دیکھا اور پھر یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو بانی شہر حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کے گنبد کے زیر سایہ ایک زبردست پروگرام پیش کرایا۔ اس جلسہ کی صدارت مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ نے کی۔ عابد علی خاں نے پہلا مشاعرہ جب منعقد کیا تو اس میں بمشکل ۲۰۰ سامعین موجود تھے اور اپنی زندگی کے آخری سال انھوں نے قلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں ۸ اپریل ۱۹۹۲ء کو جو مشاعرہ منعقد کیا تھا اس میں تقریباً ۴ ہزار افراد نے شرکت کی ٹکٹ فروخت کرنا دشوار ہو گیا تو عوام کو مفت داخلہ دے دیا گیا۔ عابد علی خاں نے مشاعروں کو جو عام طور پر راجا مہاراجاؤں اور نوابوں کی ڈیوڑھیوں میں منعقد ہوتے تھے انھیں عوامی نوعیت عطا کی اور ان کو سڑکوں پر لے آئے۔ چنانچہ ایوان شاد

کا تمثیلی مشاعرہ اس کا ثبوت ہے۔ جب بھی کوئی مشاعرہ منعقد ہوتا اس کے بعض مصارف کی پابجائی انھیں اپنی ذات سے کرنی پڑتی تھی۔ وہ تقریباً سولہ سال تک شنکرجی میموریل سوسائٹی کے نائب صدر رہے اور سولہ سال تک شنکرجی یادگار مشاعرے اسی طرح منعقد کراتے رہے جس طرح کہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ مشاعرہ ان کے لیے مالیہ اکٹھا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا۔ انھوں نے جتنے بھی فلاحی کام انجام دیئے ہیں وہ مشاعروں کی آمدنی کی ہی دین ہیں۔ انجینئرنگ اور میڈیسین کی درسی کتابیں بے حد قیمتی ہوتی ہیں اور ہر طالب علم انھیں خرید نہیں سکتا اس کے لیے انھوں نے اردو گھر میں ایک بک بنک قائم کیا جہاں طلبا اور طالبات ان کتابوں سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

جو لوگ اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی بقا کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں ان پر اکبرالہ آبادی نے تیکھا طنز کیا تھا اور کہا تھا:

ہر رنگ کی باتوں کا مرے دل میں ہے جھرمٹ
اجمیر میں کلیجا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ

لیکن اکبرالہ آبادی کو اپنے خیالات تبدیل کرنے پڑے اور جب سرسید کا انتقال ہوا تو انھوں نے کہا تھا:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
یہی ہے فرق اک کہنے والے کرنے والے ہیں

اکبرالہ آبادی کے اس شعر میں کوئی تحریف کئے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اطلاق عابد علی خاں پر بھی ہوسکتا ہے۔ عابد علی خاں نے وصیت کی ہے کہ ان کی قبر پر کوئی کتبہ نہ لگایا جائے لیکن انھیں جاننے والوں کے ذہن میں ان کا یہی کتبہ ہوسکتا ہے۔ "یہ اس شخص کی ابدی آرام گاہ ہے جس کی زندگی جہد مسلسل اور عمل سے عبارت تھی اور جس کا فیض۔ فیض جاریہ تھا۔"

سیدہ فاطمہ شجیع
عابد منزل۔ لکڑی کا پل
حیدر آباد

عابد علی خاں۔ پوتی کی نظر میں

میرے دادا جناب عابد علی خاں صاحب کی خواہش تھی کہ میں گریجویشن کے بعد صحیفہ نگار بنوں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں جرنلزم کا کورس بھی مکمل کروں، یہ ممکن نہ ہو سکا لیکن میں نے تعلیم کے ختم پر دادا اور ابا جناب زاہد علی خاں صاحب کے ہمراہ دفتر سیاست جانا شروع کیا۔ صبح میں پہلا کام تمام مقامی اخبارات پر ایک نظر کے بعد پہلی ڈاک کا مطالعہ اور پھر اڈیٹوریل سیکشن کی ڈاک جس میں مضامین، مراسلے، خبروں کی تقسیم ہوا کرتی۔ اس تقسیم کے بعد سیاست کے انتظامی شعبہ، سرکیولیشن، اشتہارات اور اکاؤنٹس کی ڈاک کے لیے متعلقہ سیکشن کے منتظمین سے گفت گو ہوتی۔ خود دادا کے نام جو ڈاک آتی تھی وہ اپنے پاس رکھا کرتے۔ اخبارات اور ڈاک کے مطالعہ کے بعد میں اڈیٹوریل سیکشن میں چلی آتی جہاں والد اور چاچا جگر صاحب کی میز پر بیٹھ کر میں ترجمہ اور خبروں کی ترتیب کے کام میں مصروف ہو جاتی۔ جب تک دادا کے اجلاس پر بیٹھی رہتی۔ اگر کوئی اہم شخصیت آتی تو دادا میرا تعارف یوں کراتے کہ سیاست میں یہ تیسری نسل ہے۔ ان سے ملنے والوں کی اتنی کثیر تعداد تھی کہ ان کے اجلاس کی کرسیاں اکثر ناکافی ثابت ہوتیں۔ ان سے ملنے کے لیے بلا تکلف لوگ چلے آتے۔ اگر کسی سے علاحدہ بات کرنی ہوتی تو وہ اپنے کمرے سے باہر ہال میں علاحدہ کرسیوں پر بیٹھ کر بات کرتے۔ میں نے تین چار سال کے عرصہ میں یہ دیکھا کہ وہ ایک بجے تک صرف ملاقات میں مصروف رہتے۔ ملنے والوں میں بیرونی مہمان، مقامی وی آئی پی، اضلاع کے اصحاب اور ادیب و شاعروں کے علاوہ ضرورت مند بھی آتے۔ جن کے لیے ان کے پاس کبھی پیسے کی کمی نہیں رہی۔ عوام کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ملک و بیرون ملک سے ہر ماہ انھیں سیکڑوں، ہزاروں روپے دیے جاتے کہ وہ جس مناسب کام پر چاہیں خرچ کریں۔ دادا طلبہ کی فیس، بیرون ملک تعلیم کے لیے اخراجات، غریب لڑکیوں کی شادی اور علاج معالجہ کو ترجیح دیتے تھے۔

دادا یہ کہا کرتے تھے کہ ان کی کوئی خانگی زندگی نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ وہ صبح سویرے اٹھتے، نماز، تلاوت اور وظیفہ کے بعد سیاست پڑھتے، گھر پر کچھ انگریزی اخبارات پر ایک نظر ڈالتے اور ناشتا کے بعد ۹ بجے دفتر کے لیے نکل پڑتے۔ ایک بجے

واپس آکر کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے اور ۳ بجے پھر دفتر چلے آتے۔ ۳ بجے سے ۸ بجے تک دفتر ہی میں رہتے۔ بمشکل ایک گھنٹہ انھیں دفتر کے کام کے لیے ملتا تھا جس میں وہ خطوط کے جوابات لکھتے لکھواتے اور دفتر کو ہدایات دیتے۔ بقیہ سارا وقت لوگوں سے ملنے میں گزرتا۔ رات کو گھر پر کھانے کے بعد اخبارات کا مطالعہ اور خبروں کی سماعت کے بعد سونے چلے جاتے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہو کہ گھر کے مسائل پر تمام گھر والوں سے گفت گو کی ہو۔

اتوار کے دن بھی وہ صبح دفتر جاتے اخبارات کے مطالعہ کے بعد واپس آتے۔ اور پھر ۴ بجے شام جاکر ۸ بجے واپس ہوتے۔ ان کی کوئی خانگی زندگی نہیں تھی۔ فرصت سے گھر پر بھی برابر مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ دادا سے ملنے والوں میں ایک عام آدمی سے لے کر ایک وی آئی پی تک آتے اور وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ میں نے ان کی ایک دن کی روئیداد آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن ایک دن میں ان کے کئی کام بھی ہوا کرتے۔ اب سوچتی ہوں کہ کس کا ذکر کروں۔ پچھلے دو تین سال سے حیدرآباد کے ۴۰۰ سال کا جشن ان کی اہم دلچسپی و مصروفیت تھی۔ انھوں نے حیدرآباد پر کئی قصّے کہانیاں جمع کیں۔ انھیں خود کئی قصّے یاد تھے جو انھوں نے اپنی نانی اور دادا سے بچپن میں سنے تھے جب دادا سے کوئی ملنے آتا اور حیدرآباد پر گفتگو ہوتی تو وہ ایسے کئی قصّے سناتے۔ اُن سے اصرار کیا جاتا کہ آپ اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کریں۔ وہ جواب دیتے کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر وقت نہیں ملتا۔ انھوں نے سیاست کے ذریعہ قارئین سے خواہش بھی کی تھی کہ حیدرآباد کے پرانے قصّہ کہانیاں جو انھیں یاد ہوں، روانہ کیے جائیں۔ انھوں نے حیدرآبادی محاورے اور کہاوتیں بھی جمع کی تھیں اور ان کو اوّلاً اخبار میں اور پھر کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ مگر اگست سے ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ کام مکمل نہ کر سکے۔ میں اس موقعہ پر ایک قصّہ پیش کر رہی ہوں جو انھوں نے اردو گھر کے ایک جلسہ میں سُنایا تھا۔

سکندر جاہ کا زمانہ تھا، چار مینار پر ایک سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا، ایک خاتون ہاتھ میں تھالی لیے آرہی تھی، سنتری نے دریافت کیا کہ تم کون ہو، خاتون نے جواب دیا "میں لکشمی ہوں"، سنتری نے کہا! بہن تم کچھ دیر یہاں ٹھہری رہو میں ابھی آتا ہوں، کچھ ضروری کام ہے۔ سنتری نے سوچا یہ لکشمی ہے اس کا یہاں ٹھہرنا بہت ضروری ہے۔ سنتری چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ لکشمی کا یہ اثر ہے کہ چار مینار کے چاروں طرف خوش حالی ہے۔ ایک طرف سونے چاندی کا بازار ہے، دوسری طرف سہاگ کے سامان کا بازار ہے، تیسری طرف مٹھائی کا بازار ہے اور چوتھی طرف مسجد ہے۔ دادا کو ایسے کئی قصّے یاد تھے جس سے حیدرآباد کی عظمت و تہذیب اجاگر ہوتی تھی۔

دادا گھر میں بہت کم وقت گزارتے۔ صرف علالت کے دوران گھر میں رہتے تھے

ان کے ممتاز معالج ڈاکٹر سدھیر نائک سے شفقت آمیز لہجے میں درخواست کرتے کہ کم از کم مجھے ایک گھنٹہ کے لیے دفتر جانے کی اجازت دی جائے۔ دفتر میں ان کی مصروفیت مشاعرہ، سیمنار، ادبی تقاریب، سیاست توسیعی تقریر کا انتظام یا پھر خود کئی جلسوں میں شرکت تھی حیدرآباد کی ہر بڑی تقریب میں ان کی شرکت لازمی تھی۔ چاہے یہ تقریب علمی ہو یا سماجی یا عوامی۔ حیدرآباد میں اردو کے لیے بڑے جلسے، تقاریب اور مشاعرے جو بھی ہوتے دادا کا ان میں بڑا اہم حصہ رہا ہے۔ جب غالب صدی تقاریب منائی جا رہی تھیں، جناب فخرالدین علی احمد نے حیدرآباد میں ان تقاریب کے لیے دادا کو داعی مقرر کیا۔ کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں جتنا اچھا جلسہ ہوا، ملک میں کسی اور شہر، حتیٰ کہ دہلی میں بھی نہیں ہوا۔ اس کا ثبوت ایک کتاب غالب اور حیدرآباد ہے جو جناب ضیاء الدین شکیب نے مرتب کی ہے۔ دادا نے غالب کا چوغا اور ان کی مہر بھی اس موقعہ پر آغا حیدر حسن صاحب مرحوم سے حاصل کرتے ہوئے اس کی نمائش کی تھی۔ ترلوک ناتھ راؤ جب مرکزی وزیر تھے اور اقبال کی غالباً پچاس سالہ سالگرہ منائی جارہی تھی۔ دادا کو کنوینر مقرر کیا گیا تھا۔ جوبلی ہال میں بڑے شاندار پیمانہ پر یہ جشن منایا گیا۔

انھوں نے اقبال صدی تقاریب کا بھی ۱۹۸۶ء میں اہتمام کیا تھا۔ جس میں پاکستان برطانیہ اور امریکہ سے بھی مندوبین شریک ہوئے۔ اس موقعہ پر اقبال پر ایک یادگاری ٹکٹ کا اجراء بھی دادا ہی کی کوششوں کے باعث عمل میں آیا۔ ان دنوں تلگو دیشم کی حکومت تھی۔ این ٹی راما راؤ نے حسین ساگر کے ایک میل لمبے بند پر تمام آندھرائی قائدین کے مجسمے نصب کرا دیے، دادا کی کوششوں سے حیدرآباد میں اردو والوں کی جانب سے ایک ادبی اور واحد یادگار اقبال مینار سکریٹریٹ جیسے اہم مقام پر تعمیر کرائی۔

ایک اور مصروفیت کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں کہ دادا ایک منٹ بھی خاموش نہیں رہتے تھے۔ چاہے وہ گھر پر ہوں یا دفتر میں اکثر کچھ کام کر رہے ہوتے۔ کتاب یا رسالہ پڑھنا شروع کرتے۔ گھر میں بھی ان کا زیادہ وقت اپنی لائبریری کے کمرے میں گزرتا۔ گزشتہ سال بھر سے وہ حیدرآباد پر کتابیں اور نوادرات جمع کرنے میں مصروف تھے چنانچہ انھوں نے حیدرآباد پر کئی نادر کتابیں جمع کی ہیں اور سیاست لائبریری میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔ عابد علی خاں صاحب کی خدمات پر اردو ریسرچ اسکالرز کا ایک اجلاس اسی ماہ یہاں منعقد ہوا تھا۔ جناب ہاشم علی اختر، سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی نے جو دادا کے کالج کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ یہ بیان کیا کہ عابد علی خاں کی زندگی بڑی عظیم تھی اور ان کی موت بھی عظیم تھی۔ دادا قلب کے مریض تھے۔ ۱۲ر نومبر کی رات ۲ بجے سانس لینے میں تکلیف محسوس کی ۲ بجے انتقال کر گئے۔ انتقال سے پہلے ایک شام وہ رات کے ۸ بجے تک دوستوں سے ملاقات کرتے رہے۔ صبح جب ٹی وی اور ریڈیو سے ان کے انتقال کی خبر سنی گئی جس رنج و ملال کا اظہار ہوا ہے اس کا ایک اندازہ ملک اور بیرونِ

ملک کے کئی شہروں سے ٹرنک کالس سے ہوا۔ گھر کے تینوں ٹیلی فونس اور دفتر سیاست کے تمام ٹیلی فون پر مسلسل انتقال کے بارے میں دریافت کیا جاتا رہا۔ صبح سویرے سے گھر پر ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ سینکڑوں خواتین بھی بلا لحاظ مذہب و ملت تشریف لا رہی تھیں۔ گھر پر فاتحہ سیوم میں اتنی زیادہ خواتین آئیں کہ ہمارا گھر کافی نہیں ہوا جہاں جگہ ملی وہ وہاں بیٹھ گئیں۔ مردوں کی طرح حیدرآباد کی خواتین نے بھی انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ میری دادی اور نانی کہتی ہیں کہ حیدرآباد میں ایسی بات اس سے پہلے کبھی سُنی نہیں گئی۔ دادا جب کسی سے میرا تعارف کراتے تو یہ کہتے، سیاست میں یہ تیسری جنریشن ہے یقیناً اردو اخبارات میں یہ ایک نیا تجربہ ہے اور یہ بھی عابد علی خاں صاحب کی ایک دین ہے۔